چمکتے موتی دمکتے تارے
PDFBOOKSFREE.PK
مؤلف
حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم فلاح دارین
ترکیسر سورت گجرات
مکتبہ مفید الاسلام
ترکیسر سورت گجرات (انڈیا)-394170

چمکتے موتی دمکتے تارے

یعنی......

معاشرتی آداب اور اسلامی اخلاق کے سلسلے میں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چالیس اہم ارشادات

مؤلف

حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب قاسمی

استاذ حدیث: دار العلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات

اصلاح معاشرہ کے لئے ایک اہم اور نادر تحفہ جسمیں معاشرے اور افراد میں پائی جانے والی غفلت، نفسانیت، بے حسی، بے اصولی، بے ادبی، بے فکری بے حیائی، بے رحمی، ظلم وتشدد جیسی برائیوں سے بچنے اور تمام اخلاقی قدروں اور محاسن کو اپنانے کی ارشادات نبوی کی روشنی میں بڑی دل سوزی سے ہدایت کی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب ہر گھر اور ہر فرد بشر کی ضرورت بن گئی ہے، نیز جمعہ سے پہلے تقریر کرنے والے حضرات اس کتاب کی ان چالیس احادیث میں سے ایک حدیث کی تشریح کر سکتے ہیں، جو دس منٹ میں ہو سکتی ہے۔

تفصیلات

نام کتاب	:	چمکتے موتی دمکتے تارے
مصنف و مؤلف	:	(مولانا) سید ذوالفقار احمد (صاحب دامت برکاتہم)
صفحات	:	۷۲
تعداد	:	۱۱۰۰
سن اشاعت	:	۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰۵ء
کتابت	:	محمد مہر علی قاسمی (دھنباد، جھارکھنڈ) جامعہ اکل کوا
ناشر	:	مکتبہ مفید الاسلام ترکیسر، سورت، گجرات، انڈیا
قیمت	:	

رابطہ

☆ مکتبہ سعیدیہ، ترکیسر سورت، گجرات، انڈیا

☆ سید ذوالفقار احمد، جامعہ فلاح دارین ترکیسر، سورت، گجرات

☆ دفترِ بیان، مصطفیٰ، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، مہاراشٹر

☆ دفترِ شاہراہِ علم، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، مہاراشٹر

☆ مکتبہ نعیمیہ، دیوبند

"انتساب"

مرحوم والد بزرگوار محترم جناب الحاج الحافظ مختار احمد صاحب کے نام جو اپنی ۹۲ رسالہ طویل زندگی میں کثرتِ تلاوت قرآنِ پاک کے خداداد ذوق کے ساتھ ساتھ مناجات، ماثور ومسنون دعاؤں وچہل حدیثوں کے مجموعوں کو اپنے روزمرہ کے اوراد ووظائف کے معمولات میں شامل رکھتے تھے مرحوم کی اس دلچسپی ہی نے اس ناچیز کو چہل حدیث کے اس انتخاب اور اس کی تشریح کی ترغیب وتحریص دی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کاوش کو دونوں کیلئے ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین۔

فہرس

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مُقدّمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص امت کے فائدہ کے لیے دین کے کام کی چالیس حدیثیں یاد کرے گا اور لوگوں کو سنائے گا، قیامت کے دن خدا تعالیٰ اس کو علما اور شہدا کی جماعت میں اٹھائے گا۔ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

اس بشارت کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے چہل حدیث جمع فرمائی ہیں، جن میں بعض کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن مبارکؒ (متوفی / ۱۸۱ھ)، محمد بن اسلم طوسیؒ (متوفی /۲۸۲ھ)، حسن بن صفوانؒ (النوری/ ۳۰۳)، ابوبکرؒ (الآجری/ ۳۶۰)، ابوالحسن علی بن عمرؒ (الدار قطنی/ ۳۸۵)، ابوبکر ابراہیم بن ابراہیمؒ (الاصفہانی/ ۴۶۶)، ابوبکر احمد بن حسینؒ (البیہقی / ۴۸۵) محی الدین النووی شارح مسلم/ ۶۷۶، مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) وغیرہم۔

حدیث (۱) سلام پیغامِ محبت

وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْه اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: اِذَا لَقِیَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ فَاِنْ حَالَتْ بَیْنَهُمَا شَجَرَةٌ اَوْجِدَارٌ اَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِیَهٗ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ.

رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ (باب السلام،ص/۳۹۹) مشکوٰۃ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ سلم سے نقل فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ سلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے ملے، تو اس کو سلام کرے، پھر اگر (سلام کرنے کے بعد چلتے چلتے) کوئی درخت یا دیوار یا بڑا پتھر تمہارے اور اس کے درمیان (اس طرح) حائل ہو جائے کہ معمولی سے وقفہ کے لیے وہ تم سے اوٹ میں ہو جائے) اور پھر نظر آنے پر دوبارہ سلام کرو۔

تشریح: ہر مذہب اور تہذیب نے ایک دوسرے سے ملاقات کے کچھ آداب اور کلمات سکھلائے ہیں، جن میں بعض آداب وکلمات مذہبیت کا رنگ لیے ہیں اور بعض صرف کسی وقت کو اچھا بتلانے کے لئے ہیں پھر اس کی ادائیگی کے بھی مختلف طرز ہیں، اسلام نے اپنے پرستاروں کو اس موقع کے لیے بہترین الفاظ "السلام علیکم" سکھلائے، جو ایک اچھی دعا بھی ہے اور ایک مختصر پیغامِ محبت بھی۔ السلام علیکم میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے وہ تمام دعائیں دے دیتا ہے، جس کی اس کو ضرورت ہے۔ اللہ کی طرف سے ہر قسمی سلامتی اور تمام مشکلات سے حفاظت کے معنی کو یہ دعائیہ کلمات "السلام علیکم" شامل ہیں نہ اس میں ہاتھ اٹھانا ہے کہ جس میں غیروں کی اتباع کی بُو آئے اور نہ بدن اور سر کا جھکانا ہے کہ جس میں تعظیم غیر اللہ کی ممنوع ہیئت نمایاں ہو۔ اور نہ کسی مخصوص وقت کے وجود وعدم وجود اور اس کے اچھے بُرے ہونے کی خبر ہے، جو بے حاصل ہے بل کہ اس میں ایک مسلمان کی جانب سے اپنے پیارے مسلمان بھائی کے لیے ہمیشہ امن وامان، سلامتی وحفاظت کے اللہ کی طرف سے

حاصل ہوتے رہنے کی ایک جامع دعا ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد میں اور بھی بہت سی خوبیاں جمع ہیں:

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسلمان کو بھائی قرار دیا جس میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھنے کی تعلیم ہے، تا کہ اجنبیت دور ہو اور کلمہ کا رشتہ خونی رشتہ کے مساوی نظر آئے اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملاقات کے وقت حقیقی بھائی سے ملاقات جیسے جذبات سے سرشار معلوم ہو۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں سلام کرنے میں پہل کرنے کی تعلیم دی، اسی لیے اس کے سلام کے انتظار کرنے کو نہیں فرمایا، بل کہ خود سلام کرنے کو کہا تا کہ ابتدائے سلام کرکے زیادہ ثواب کا بھی مستحق ہو اور کبر وغرور کی بھی جڑ کٹے جو ایسے موقع پر دوسرے کی طرف سے سلام کرنے کی تمنا سے پیدا ہوتا ہے۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں جس پر سلام کیا جائے اس کے ہم مرتبہ یا ہم عمر ہونے کی بھی قید نہیں لگائی، بل کہ غریب، امیر، ہم عمر، چھوٹے کسی بھی طبقہ اور عمر یا حیثیت کا آدمی ہو، سب کو سلام کرنے کی ترغیب دی۔

(۴) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانے پہچانے ہونے کی بھی قید نہیں لگائی، بل کہ ارشاد کو عام رکھ کر یہ تعلیم دی کہ خواہ شناسا شخص ہو یا اجنبی، سلام ہر مسلمان کا وہ حق ہے جو اس کو ہر حال میں ملنا چاہیے۔

(۵) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملاقات کے وقت گفتگو سے پہلے سلام ہونا چاہیے تا کہ ابتدائے سلام جیسے مبارک کلمات سے ہو چوں کہ دعائیہ کلمات سن کر گفتگو کے انداز میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے، خواہ وہ شخص کتنا بڑا دشمن ہی کیوں نہ رہا ہو۔

(۶) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام کی ابتدا کرنے میں اس ڈر کو حائل نہ ہونا چاہیے کہ سننے والا جواب نہیں دے گا، خواہ وہ سلام کا جواب دے یا نہ دے سلام کرنے والے کو سلام کرنا چاہیے، جواب نہ دینا یہ اس کا فعل ہے، اس نے گناہ کیا، اس لیے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، مگر آپ ثواب کمانے سے کیوں باز رہیں جب کہ سلام کرنا سنت ہے۔

(۷) نیز آپ کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام مصافحہ اور معانقہ سے بھی پہلے ہونا چاہیے اس لیے کہ "ف" جو "فلیسلم" پر داخل ہے، وہ تعقیب بلاتراخی کو چاہتی ہے۔

(۸) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام ہی کے لفظ سے سلام ادا ہونا چاہیے اپنی طرف سے وضع کردہ اس موقع کے وہ تمام کلمات منسوخ ہیں، جو اسلام سے قبل بولے جاتے تھے یا آج بعض قوموں کا شعار ہیں۔

(۹) نیز "احدکم" کے لفظ سے معلوم ہوا کہ سلام صرف مردوں ہی کا شعار نہیں، بل کہ عورتیں بھی آپس میں سلام کرنے کی اسی طرح پابند ہیں جیسے کہ مرد۔

(۱۰) نیز مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو بھی سلام کرسکتی ہیں، جب کہ فساد کا خطرہ نہ ہو۔

(۱۱) نیز "فلیسلم" میں امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جس سے اگر چہ وجوب تو نہیں سمجھا گیا ہے، مگر اس کی سُنّیت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں، سلام کی یہ ہی ایک خصوصیت ہے کہ اس کا ابتداء کرنا اگر چہ سنت ہے، مگر جواب دینا واجب ہے، لیکن اس کے باوجود سنت یعنی ابتداءً سلام کرنے کا ثواب واجب یعنی جواب دینے سے بڑھا ہوا ہے۔

(۱۲) "فلیسلم" میں "علیہ" سے یہ بھی معلوم ہوا کہ السلام علیکم کے پورے الفاظ بولنے چاہیے نہ کہ صرف سلام۔ سلام کا لفظ۔

(۱۳) چوں کہ "السلام علیکم" ایک مبارک دعائیہ کلمہ تھا، اس لیے اسلام نے اس کی کثرت کو پسند کیا ہے کہ اس قدر سلام کیا جائے کہ یہ کلمہ وردِ زبان ہو جائے، اور ہر شخص کا جانا پہچانا بن جائے اور ہر نئی ملاقات اور ہر غیوبت کے بعد خواہ وہ بار بار ہو یا معمولی مدت کے بعد ہو، سلام نئے سرے سے کیا جائے؛ چناں چہ اس کی انتہائی شکل اور کثرت کو نمایاں کرنے کے لیے نبی ﷺ نے مثال بیان فرمائی کہ اگر تم کسی مسلمان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہو اور اس رفتار کے درمیان اگر کوئی درخت یا پتھر یا دیوار کی اوٹ آجائے اس طرح کہ تم دیوار یا درخت کے ایک طرف سے نکلے اور وہ دوسری طرف سے، تو نظر پڑتے ہی فوراً پھر سلام کرو۔ ظاہر ہے اس سے سلام کی کتنی کثرت وشیوع کو پسند کیا گیا ہے وہ واضح ہے۔ بہر حال سلام تو ایک بہترین دعائیہ کلمہ ہے، وہ جتنی بار بھی ہو کم ہے۔

نیز اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ دوسری بار بھی سلام میں پہل کرنے کی تم کو ہی کوشش

کرنا چاہیے، یہ نہ سوچا جائے کہ پہلی مرتبہ ہم نے ابتداء کی تھی: اب دوسری ملاقات میں اس کو پہل کرنی چاہیے۔ نیز آپ کیوں ہر بار پہل کرنے کے ثواب سے محروم رہنا چاہتے ہیں، آپ خود اس شرف کو ہر بار ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

(۱۴) چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک شارع کی ہے، اس لیے اسلامی سلام اب صرف تمدن اور تہذیب کی پیداوار نہیں رہا بل کہ وہ ایک دینی فعل اور عبادت ہے، جس پر اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

(۱۵) جب یہ ایک دینی امر ہے تو سلام کرنے والا اس کو دینی نقطۂ نظر اور عبادت اور اجر وثواب سمجھ کر ہی کرے گا، جس کی وجہ سے اس دعا میں اس کی طرف سے انتہائی خلوص و محبت اور اپنائیت ہوگی، جو سننے والے کے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہے گی۔

(۱۶) چوں کہ یہ ایک دینی امر ہے اس لیے دشمن و دوست کا امتیاز بھی اس میں باقی نہیں رہے گا، بل کہ اپنے پرائے، دوست دشمن ہر ایک کو کرنا ضروری ہوگا۔

(۱۷) اور جب خلوص و محبت میں ڈوبے ہوئے یہ کلمات دشمن سنے گا، تو اس کا دل بھی پسیجے بغیر نہیں رہ سکتا، دشمنی کو ختم کرنے کا بہترین ذریعہ بنے گا۔

حدیث (۲) نام کی تاثیر

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ بِنْتًا كَانَتْ لِعُمَرَ يُقَالُ لَهَا عَاصِيَةُ فَسَمَّاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمِيْلَةَ. رَوَاهُ أَبُوْ دَاؤُدَ

مشکوٰۃ (باب الاسامی ص/۴۰۷)

ترجمہ: ابن عمرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے ایک لڑکی تھی (یعنی ہماری ایک بہن تھی) جس کا نام عاصیہ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا۔

تشریح: غالباً دور جاہلیت میں حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی کا یہ نام رکھا ہوگا، یا یہ کہ عیص کے معنی کثیر کے بھی آتے ہیں، عصیان ہی سے صرف نہیں آتا کہ عاصی کا مؤنث ہے۔ یہ بات اس لیے کہی جارہی ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے شخص حالت اسلام میں یہ نام نہیں رکھ سکتے

تھے۔ بہر حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو جس میں ایک جہت عصیان کی نمایاں تھی، بدل دیا۔ اور جمیلہ رکھ دیا۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوا کہ نام اچھا رکھنا چاہیے، ایسا نام نہ رکھا جائے جس کے معنی برے ہوں، جیسے کلب، حرب، صخر، کمینہ، چھچھن۔

(۲) نیز یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ برے نام کا اثر مسمی پر پڑتا ہے، برے نام کے بار بار لینے اور اس کے تصور سے مسمیٰ کے صفات واخلاق متاثر ہو سکتے ہیں اس لیے برے نام رکھنے سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔

(۳) نیز اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوا کہ اگر کسی غلط فہمی یا کسی وجہ سے برا نام رکھ لیا گیا ہو تو اس کو بعد میں بدل دینا چاہیے: دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی صاحبزادی کا نام تبدیل کر دیا۔

(۴) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کے بچے کے کسی برے نام کو کوئی تبدیل کر دے یا تبدیل کرنے کو کہے تو اس کے سرپرستوں کو فوراً قبول کر لینا چاہیے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم چوں کہ پہلے رکھ چکے ہیں اس لیے اب تبدیل نہیں کریں گے: دیکھو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً قبول فرمالیا۔

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات کی روشنی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نام رکھنے میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ نہ تو نام کسی برے معنی کو شامل ہو اور نہ ہی نام ایسا ہو جس سے مسمیٰ کی بڑائی ظاہر ہو یا اس کے نیک اور متقی ہونے کا دعویٰ ظاہر ہوتا ہو حضورؐ نے دونوں قسموں کے ناموں کو تبدیل کر دیا تھا، جیسے برّہ، صخر وغیرہ۔

اللہ کو سب سے پیارے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، نیز اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جو نام رکھا جائے اس کو پورا لیا جائے، اس کو اس طرح نہ کم کیا جائے، جو گناہ کا سبب ہو، مثلاً عبدالغفار کو صرف غفار کہہ کر پکارنا، عبدالرحمٰن کو صرف رحمان کہہ کر پکارنا، یہ صحیح نہیں ہے، غفار تو اللہ کی صفت ہے، اسی طرح رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، اچھے اور بامعنی نام مبارک ہوتے ہیں، زیادہ اچھا یہ ہے کہ انبیا، اولیا کے ناموں کے ساتھ نام رکھے جائیں، اسی طرح لڑکیوں کے نام صحابیات کے نام پر رکھے جائیں، مگر یہ لازمی نہیں ہے، کوئی بھی نام رکھا

جائے مگر اس کا خیال رہے کہ وہ اچھے معنی پر مشتمل ہوں اور اسلامی نام ہوں، تا کہ نام ہی سے اس کی اسلامیت ظاہر ہو، آج کل لوگوں میں عیسائیوں جیسے انگریزی نام مائیکل یا پپو، پنکو، ٹنکو وغیرہ جو نام رکھنے کا رواج نکل پڑا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے، اس سے ایک مسلمان کو غیرت آنی چاہیے، اور اپنے معاشرے کو ایسے ناموں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے، ایسے ہی وہ نام بھی نہ رکھنا چاہیے جن میں شرک کی بو آتی ہو، جیسے عبدالنبی، خواجہ بخش وغیرہ۔

حدیث (۳) دو اچھی اور دو بری خصلتیں

رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: خَصْلَتَانِ لَاشَيْئَ أَفْضَلُ مِنْهُمَا: اَلْإِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَ النَّفْعُ لِلْمُسْلِمِيْنَ، وَ خَصْلَتَانِ لَاشَيْءَ أَخْبَثُ مِنْهُمَا: اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَ الضَّرُّ بِالْمُسْلِمِيْنَ. (از منبہات، ص/۵)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو خصلتیں ایسی ہیں جن سے اچھی کوئی چیز نہیں ایک اللہ پر ایمان لانا۔ دوسرے مسلمانوں کو نفع پہونچانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: دو خصلتیں ایسی ہیں کہ ان سے زیادہ بُری کوئی خصلت نہیں ہے، ایک اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔ دوسرے مسلمانوں کو تکلیف پہونچانا۔

تشریح: حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی کام کی باتیں اور نصیحتیں اور دین وایمان کو پختہ کرنے والے امور ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

اس حدیث میں آپ نے دو چیزوں کو سب سے افضل بتلایا ہے، ایک ایمان باللہ دوسرے مسلمانوں کو نفع پہونچانا، ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور دوسرے کا حقوق العباد سے ظاہر ہے کہ اللہ کے بندہ پر جس قدر بھی حق ہیں، ان میں سب سے بڑا حق یہ ہے کہ بندہ اللہ پر ایمان لائے، اس کو اس کی تمام صفات کے ساتھ مانے؛ اگر وہ خدا کی ذات وصفات کا انکار کرتا ہے، تو گویا وہ ایک زبردست حقیقت کا انکار کررہا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایمان کے

دائرہ سے نکل جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے تمام اعمال خیر بے قیمت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سب سے افضل چیز اللہ کا اقرار اور اس پر ایمان لانا ہے، جس پر تمام اعمال کے ثمرات مرتب ہونے کا دارومدار ہے۔

دوسری بات مسلمانوں کو نفع پہنچانا ہے، مسلمان تو ہر مخلوق کا خیر خواہ اور اس کو نفع پہنچانے کا عادی ہوتا ہے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم، چاہے حیوانات ہوں یا نباتات، وہ ہر مخلوق کا خیر خواہ ہے اور سب کے لیے نافع ہے، مگر کیوں کہ رات دن اس کے معاملات و برتاؤ اور رہن سہن مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے، پانچ وقت وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ نماز میں جمع ہوتا ہے اس لیے "وَالنَّفعُ لِلمُسلِمِین" ذکر کر دیا گیا ہے کہ جن کے ساتھ رات دن کا اٹھنا بیٹھنا ہے ان سے رقابت اور اَن بَن ہو جانے کا شدید خطرہ رہتا ہے بل کہ ہو ہی جاتی ہے۔ مگر مسلمان جب ان کا بھی خیر خواہ و نفع رساں ہے تو دوسروں کے ساتھ جن سے کبھی کبھی واسطہ پڑتا ہے بدرجہ اولیٰ نفع رساں ہوگا۔ یا مسلمین کی یہ قید احترازی بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ یا تو ذمی ہوں گے یا مستامن ہوں گے یا حربی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ذمی اور مستامن کو تو امن دے دیا گیا ہے، تو ان کی جان مال مسلمان کے نزدیک مسلمان کی طرح ہی محفوظ ہے، نیز ان کی خیر خواہی بھی ہوگی بل کہ ان کو اگر مسلمان قتل کرے گا تو اس کو ان کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ لہٰذا وہ تو مسلمین میں داخل سمجھے جائیں گے۔ اب رہا حربی جس کے ساتھ جنگ جاری ہے تو اس کے ساتھ خیر خواہی اور نفع رسانی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، وہ تو واجب القتل ہے۔

شرک توحید کی ضد ہے، خدا کی صفات کسی مخلوق کے لیے ماننا اور کسی مخلوق کو اللہ کا شریک گردانا، اللہ کو قطعاً گوارہ نہیں، یہ فعل انسان کے لا الٰہ الا اللہ کے اقرار اور عقیدے کے منافی ہے، اس نے جو توحید کا اقرار کیا ہے اس کے منافی ہے، شرک پر بے پناہ وعیدیں نصوص میں وارد ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرما دیں گے مگر شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے۔ توحید اخلاص چاہتی ہے کہ ہر کام اللہ کے لیے ہو اور شرک اخلاص کی ضد ہے جس میں عبادت اور نیک اعمال غیر اللہ کو خوش کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں اس لیے شرک کو بدترین خصلت قرار دیا گیا ہے۔

دوسری بری خصلت اضرارِ مسلم کو بتلایا گیا ہے، ویسے تو کسی بھی جاندار کو تکلیف پہونچانا برا ہے؛ مگر مسلمان جس کے ساتھ رات دن رہتا سہتا اور عبادت کے مجامع میں شرکت رہتی ہے، اس کی بدخواہی اور نقصان رسانی بدترین خصلت ہے، ایذائے مسلم کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے، مخلوق تو اللہ کی عیاد ہے، اس کی ایذا اللہ کو ناراض کرنے کا سبب ہے اور اگر وہ مسلمان اللہ کا ولی ہے، تب تو اس کی ایذا رسانی پر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے جنگ کا اعلان کیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ایک مسلمان کسی کے درپئے آزار نہ رہے، اگر نفع پہونچانے کی ہمت نہ ہو، تو کم از کم نقصان تو نہ پہونچائے۔

بہرحال نفع رسانی کا اقدام اور ایذا رسانی سے اجتناب، یہ دونوں خصلتیں انسانیت کا وہ جوہر ہیں یہ خصلتیں جہاں اس عالم میں امن وامان محبت اور آشتی بڑھاتی ہیں، وہیں انسان کی آخرت بھی سنوارتی ہیں ایمان باللہ انسان کو دنیا میں اطمنان اور آخرت میں نجات کا ضامن ہے، جب کہ شرک دنیا میں بے چینی، انتشار اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے جہنم کا مستحق بناتا ہے۔

ارشادِ نبویؐ میں یہ چار باتیں ایسی ذکر کی گئی ہیں کہ انسان ان کو زندگی میں اگر اپنالے تو وہ خدا کا پسندیدہ بندہ بن سکتا ہے۔ ایمان باللہ اور شرک جلی وخفی سے کلی اجتناب انسان کو پکا موحد بناتا ہے۔ تو اللہ کے علاوہ کسی کو معبود مانا جائے، نہ مقصود سمجھا جائے غیر اللہ کو معبود ماننے کا جہاں تک تعلق ہے اس سے تو لوگ بچتے ہیں مگر جہاں تک مقصود ماننے کا سوال ہے، اس میں بڑی کوتاہی ہے، اپنے دنیاوی مقاصد اور حاجات اور مشکلات میں اولیاء اللہ اور انبیاء وصلحا کو لوگ اپنا مقصود یا حاجت روا اور مشکل کشا بنا کر قولاً وفعلاً ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں، جو صرف خدا کے ساتھ کرنا چاہیے انبیاء، اولیاء، صلحا بھی اپنی تمام ضروریات کی تکمیل میں اللہ ہی کے محتاج ہیں، ان کی تعلیمات کا حاصل بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہر مخلوق کی معبود اور مقصود ہے، غیر اللہ کی نہ عبادت کی جائے، نہ ان سے مرادیں مانگی جائیں؛ بل کہ انبیاء، اولیاء نے جو اعمال کر کے اللہ کو خوش کیا اور اس کے مقرب بنے، وہی اعمال سب کے لیے تقرب کا ذریعہ ہیں، انہیں کو اختیار کر کے بندہ اللہ سے قریب ہو سکتا ہے۔

ان اعمال میں سے بندے کا اللہ کے سامنے سوال کرنا، دعا کرنا اپنی حاجت پیش کرنا بھی ہے، وہی حقیقی حاجت روا ہے۔ حاجت کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ حاجت ہے جو

اسباب کے ذریعے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے پورا کرنے کا نظام مقدر فرمایا ہے، جیسے: دوا کے ذریعے علاج، غریب کی حاجت روائی، حاکم کے ذریعے مظلوم کی دادرسی وغیرہ ان حاجات کو دنیا میں مخلوقات سے پورا کیا جاتا ہے، شریعت نے بہ ظاہر اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔ مگر وہ حاجات جو بہ ظاہر بلا اسباب پوری ہوتی ہیں وہ صرف اللہ ہی سے مانگی جاسکتی ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو پورا کرنے میں اسباب کے محتاج نہیں ہیں، لہٰذا دعا اور نذر ونذر صرف اللہ ہی سے کی جاسکتی ہے۔

بہرحال شرک جلی ہو یا خفی یا اخفی یعنی غیر اللہ کو معبود اور مقصود ماننا، ریا اور خود پسندی یہ سب ممنوع ہیں، اس کے برعکس بعض لوگ غلو کر کے غیر اللہ کے معبود اور مقصود ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ موجود ہونے کی نفی بھی کر کے اپنے کو انتہائی موحد مخلص اور شرک سے بری قرار دیتے ہیں، اس طرح وہ لاموجود الا اللہ کے قائل ہیں کہ یہ لوگ وحدۃ الوجود کے عقیدے کے قائل ہو جاتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی نصوص کے خلاف ہے اگر غیر اللہ موجود ہی نہیں ہے، اس کو اللہ نے پیدا ہی نہیں کیا، مخلوقات کا وجود صرف خیالی، فرضی اور تصوری ہے تو پھر شرک سے کیوں روکا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی ممانعت کیوں آئی؟ معلوم ہوا غیر اللہ کا دنیا میں وجود ہے، ہزاروں مخلوقات، جمادات، نباتات، انسان، حیوان، ملائکہ دنیا میں موجود ہیں تبھی تو ان کو معبود بنانے سے منع کیا گیا ہے، اور اس کو شرک کہا گیا ہے۔

بہرحال توحید بہت نازک عقیدہ ہے، شیشے سے زیادہ نازک، ذرا قولی یا فعلی شرک سے مجروح ہو جاتا ہے۔ جب کہ اسی عقیدۂ توحید پر نجات اور اعمال کی قبولیت کا مدار ہے، اس لیے اس عقیدہ کی بڑی حفاظت کی ضرورت ہے۔

اسی طرح انسانی خیر خواہی اور نفع رسانی اور ایذا رسانی اور ضرر پہنچانے سے کلی احتراز وہ خصلتیں ہیں جن کے مفید اور کار ثواب ہونے اور دنیا و آخرت میں سرخروئی کا ذریعہ ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہیں۔

حدیث ن (۴) چھوٹے چھوٹے گناہ کی نشاندہی

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَاصَغِيْرَةَ مَعَ الْإِصْرَارِ وَ لَاكَبِيْرَةَ مَعَ الْإِسْتِغْفَارِ" . (منبہات) ص ۶

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ بار بار کرنے سے چھوٹا گناہ، چھوٹا نہیں رہتا بل کہ بڑا بن جاتا ہے اور بڑے سے بڑا گناہ استغفار کرنے سے باقی نہیں رہتا بل کہ استغفار کرنا اس کو ختم کر دیتا ہے۔

تشریح: چھوٹے چھوٹے گناہ جن پر شریعت میں کوئی حد، قصاص، تعزیر اور وعید یا ان کو فحشا نہیں کہا گیا ہے بل کہ وہ مکروہ کے ارتکاب اور ایسی ممانعت کی فہرست میں آتے ہیں جن پر کوئی سخت وعید نہیں ہے، مثلاً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، قبلہ رُخ استنجے کے لیے بیٹھنا، کھڑے کھڑے پانی پینا، مسجد میں پہلے بایاں پیر رکھ کر داخل ہونا، امام کا نماز پڑھانے کے لیے محراب کے اندر اس طرح کھڑا ہونا کہ پیر باہر نہ رہیں، مسجد سے نکلتے وقت دایاں پیر باہر رکھنا، بیت الخلا میں دایاں پیر پہلے رکھ کر اندر جانا، نکلتے وقت بایاں پیر پہلے باہر رکھنا، زندگی میں اولاد کو روپیہ پیسہ مال دولت ہبہ کرنے میں لڑکا، لڑکی میں مساوات نہ کرنا، غسل خانے میں بالکل برہنہ ہو کر نہانا، کھانے پینے میں مصروف شخص یا استنجے میں مصروف یا اذان ہوتے وقت سلام کرنا، یا بدعتی یا جوا کھیلنے والے اشخاص کو اسی حالت میں سلام کرنا، مسجد میں باتیں کرنا یا زور سے بولنا، راستہ پر بول و براز کرنا، یا پتھر یا کانٹے دار چیز راستہ میں ڈالنا، سایہ دار درخت بلا ضرورت کاٹنا، نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنا، بائیں ہاتھ سے کھانا، احسان فراموشی، طوطا چشمی، ابتدا بالیمین نہ کرنا، آنکھ کان کی حفاظت نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہ، یا اسی طرح کے اور بہت سے چھوٹے گناہ ایسے ہیں جن کو بار بار کرنے اور کرتے رہنے سے پھر وہ صغیرہ نہیں رہتے، بل کہ کبیرہ بن جاتے ہیں، اس لیے جب بھی کوئی صغیرہ گناہ ہو جائے، تو اس کے بعد کوئی نیک کام کر لیں تو نیکی کرنے سے اس سے پہلے کیے گئے صغائر معاف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تحیۃ الوضو، نوافل، نفلی صدقہ، نفلی روزہ یا مستحب روزہ، یا نفلی حج، تلاوت قرآن پاک، استغفار، ذکر و اذکار، توبہ، دعا وغیرہ۔

اچھے اعمال انسانوں کی خیر خواہی، ہمدردی، داد و دہش، غم خواری، پاکیزہ زندگی، صدق مقال، یتیم، بیوہ کی خبر گیری، رفاہ عام کے کام، مظلوم کی مدد، بیمار کی تیمارداری اور عیادت، غم رسیدہ لوگوں کی تعزیت، پریشان حال کے لیے کوشش اور مدد، صلہ رحمی، مہمان نوازی، اہل محلہ اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، اپنے ملک وطن کی بہی خواہی، قومی املاک کی حفاظت، خوش خلقی، خنداں پیشانی وغیرہ، وہ نیک کام ہیں جن سے صغیرہ گناہ بلاتوبہ بھی معاف ہو جاتے ہیں: جب کہ کبیرہ بلاتوبہ کے معاف نہیں ہوتے، یا پھر اگر ان سے بلاتوبہ کئے مر گیا تو اللہ چاہیں تو معاف کر دیں، البتہ وہ کبیرہ جو حقوق العباد سے متعلق ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں فرمائیں گے، ان کا بدلہ تو نیکیوں کو دے کر یا ان کے گناہوں کو اسی حقوق العباد کو ضائع کرنے والے پر لاد کر دیا جائے گا، یا صاحب حق خود معاف کر دے تو معاف ہوں گے۔

بڑے بڑے گناہوں سے معافی کے لیے گناہوں سے توبہ و استغفار کرنے کو کہا گیا ہے، بڑے گناہ توبہ سے معاف ہو جانے کی نصوص میں بشارت دی گئی ہے۔

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ ہم سے اتنے بڑے بڑے گناہ ہو گئے ہیں اب ہماری بخشش ہو ہی نہیں سکتی، اللہ اب معاف نہیں کر سکتا، ایسا سوچنا کفر ہے، یہ ناامیدی ہے، جو حرام ہے، اللہ تو اتنے قدرت والے ہیں کہ وہ بڑے بڑے گناہ کو بخشنے پر قادر ہیں، اس لیے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کتنا ہی بڑا گناہ ہو جائے فوراً معافی مانگو، توبہ اور استغفار کر لو آئندہ نہ کرنے کا عزم کر لو، روؤ، دھوؤ انشاء اللہ گناہ معاف ہو جائے گا۔ اسی کو آپ نے بیان فرمایا: "لا کبیرۃ مع الاستغفار" بل کہ ایک بات یاد رکھو کہ جب گناہ کرنے کو دل چاہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت قہاریت، جباریت اس کی سزاؤں، جہنم اور اس گناہ پر جو وعیدیں قرآن و حدیث میں مذکور ہیں جیسے "ان بطش ربک لشدید" وغیرہ وعیدوں کا استحضار کرو، انشاء اللہ گناہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوگی، اور اگر بشریت، نفسانیت اور شیطان کے ورغلانے سے گناہ ہو ہی جائے تو اب یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ بڑے رحمن ہیں، بڑے رحیم ہیں، رؤف ہیں، بندوں سے محبت کرتے ہیں، توبہ قبول کرتے ہیں، تو انشاء اللہ اس تصور سے سچی توبہ و استغفار کی توفیق مل جائے گی۔ اور اللہ کی ذات سے امید ہے کہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

حدیث (۵) محبت معرفت الٰہی کی بنیاد

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ: "اَلْمُحَبَّۃُ اَسَاسُ الْمَعْرِفَۃِ وَ الْعِفَّۃُ عَلَامَۃُ الْیَقِیْنِ وَ رَأْسُ الْیَقِیْنِ التَّقْوٰی وَالرِّضٰی بِتَقْدِیْرِ اللّٰہِ تعالٰی (منبہات) ص ۲۳

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ محبت معرفت کی بنیاد ہے اور گناہوں سے بچنا یقین کی علامت ہے اور یقین کی اصل اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا ہے۔

تشریح: اس ارشاد گرامی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں، جو بڑی قیمتی ہیں، اگر بندہ ان کو اپنے اندر پیدا کرلے، تو وہ اللہ کا پسندیدہ بندہ بن سکتا ہے۔

پہلی بات اس ارشاد میں جو ذکر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ محبت معرفت الٰہی کی بنیاد ہے، اللہ کو پہچاننا محبتِ الٰہی کی بناء پر ہوتا ہے: انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے اس کی ذات وصفات کی معرفت حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے، جب تک اس کے بارے میں معلوم نہ کرلے صبر نہیں ہوتا، وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا محبوب کیسا ہے، اس کی کیا عادات ہیں اور کیا کیا صفات ہیں؟ اس کی کیا کیا ادائیں ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے؟ کن باتوں اور اعمال سے ناراض ہوتا ہے؟ اس کو جاننے کے لیے بے چین ہوتا ہے، جب ان سب صفات کی اس کو معرفت حاصل ہوجاتی ہے، تو پھر اس پر عمل کرتا ہے۔ جس کو کسی سے تعلق اور محبت ہی نہ ہو، تو وہ اس کے بارے میں معلومات کی کوشش ہی نہیں کرتا، نہ اس کے احوال جاننا چاہتا ہے کہ اس کی ذات صفات کی تفصیلات معلوم کرے۔ اس کا نام سن کر اس کے دل میں کوئی پہچان پیدا ہوتی نہ ملاقات کی خواہش ابھرتی ہے، نہ رویت کا اشتیاق اور نہ اس کی صفات اور خوبیوں کا تذکرہ سننا پسند کرتا ہے، لیکن اگر محبت ہو تو پھر اس کی ایک ایک ادا کو مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے، اس پر جان چھڑکتا ہے، رات دن اس کے نام کی مالا جپتا ہے، اسی کے گیت گاتا ہے

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر اواولیٰ بود

وہ اپنے آپ کو گیند بنادیتا ہے، جو گلی گلی اس کی تلاش میں بھٹکتی پھرے۔ دوسری بات یہ ارشاد

فرمائی گئی ہے کہ آدمی کے یقین اور ایمان کی علامت اور اس کی قوت اور اعتماد کا پتہ اس کی عفت سے چلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کتنا گناہوں سے، نافرمانیوں، نا مرضیات سے ناپسندیدگی سے بچاتا ہے، جتنا اس کو یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں اللہ خفا نہ ہو جائیں، ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے! وہ ہر وقت ان کی خوشنودی کے اقوال، افعال اور اعمال کی فکر میں رہتا ہے اور ناخوشی سے مجتنب رہتا ہے، تو یہ علامت ہے کہ اس شخص کا ایمان، اس کا یقین قوی ہے! اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کی جمیع صفات کے ساتھ جانا ہے، اس کے قہر و غضب کو جانتا ہے؛ تبھی تو اس نے اپنے آپ کو عفیف اور پاک دامن، صادق، امین اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خوگر بنایا ہے، گویا یقین کی ترازو، اس کا اپنے آپ کو ہر برائی سے بچانا، ہر عیب سے بچنا اور ہر گناہ کو چھوڑنا ہے۔ تیسری بات ارشاد فرمائی کہ اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا ہی یقین کی اصل ہے، اس لیے کہ جو یہ یقین کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، وہ حکیم ہیں۔ "فعل الحکیم لایخلو عن الحکمة" وہ اللہ کی طرف سے ہونے والے ہر فیصلے پر راضی ہوگا، کسی شکوے کو زبان پر نہیں لائے گا، بل کہ اگر کوئی بات خلاف طبع پیش آئے گی اور عقل اس کے اچھا ہونے کا کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی ہو تب بھی وہ یہ کہے گا کہ یہ ہماری عقل کا فتور ہے۔ اللہ کا کوئی فیصلہ غلط یا مضر نہیں ہوتا، اس فیصلے کی اچھائی اور اس کے مال کی بہتری تک ہماری ناقص عقل نہیں پہنچ پا رہی ہے، یا ہمارا دل اس کی خوبی کے ادراک سے قاصر ہے۔ یقیناً ان کے اس فیصلے میں سب بندوں کا مفاد ہے، اگرچہ صورۃً یہ بات ناگوار معلوم ہو رہی ہو، مگر مآلاً اور انجام کے اعتبار سے اس سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی یہ سوچ بن جائے، جس کا اعتبار اپنے اللہ پر اس درجہ کا ہو، سمجھ لو اس نے یقین کی گہرائی کو پا لیا ہے۔ وہ واقعتاً اللہ کو حکیم جانتا ہے، پھر جب بندے سے ایسے اعتماد و یقین کا ظہور ہوگا، تو اللہ بھی اپنے بندے کے گمان پر پورے اترتے ہیں، اس فیصلے کو اس کے حق میں ضرور مفید کر دکھائیں گے، وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکے گا کہ وہ فیصلہ جو مجھے میرا نفس ظلم بتلا رہا تھا، وہ عین انصاف اور میرے لیے سیکڑوں بھلائیوں کا ضامن ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حدیث (٦) نیک بختی اور بد بختی کی علامتیں

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: عَلَامَةُ الشَّقَاوَةِ أَرْبَعَةٌ: نِسْيَانُ الذُّنُوبِ الْمَاضِيَةِ وَهِيَ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى مَحْفُوظَةٌ، وَ ذِكْرُ الْحَسَنَاتِ الْمَاضِيَةِ وَلَا يَدْرِي أَقُبِلَتْ أَمْ رُدَّتْ، وَنَظْرُهُ إِلٰى مَنْ فَوْقَهُ فِي الدُّنْيَا وَ نَظْرُهُ إِلٰى مَنْ دُوْنَهُ فِي الدِّيْنِ، وَعَلَامَةُ السَّعَادَةِ أَرْبَعَةٌ: ذِكْرُ الذُّنُوبِ الْمَاضِيَةِ، وَنِسْيَانُ الْحَسَنَاتِ الْمَاضِيَةِ، وَ نَظْرُهُ إِلٰى مَنْ فَوْقَهُ فِي الدِّيْنِ وَ نَظْرُهُ إِلٰى مَنْ دُوْنَهُ فِي الدُّنْيَا.

(منبہات ص/٣٠)

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ بد بختی کی چار علامتیں ہیں:

(١) پچھلے گناہوں کو بھلا دینا، حالاں کہ وہ خدا کے یہاں محفوظ ہیں۔

(٢) پچھلی نیکیوں کو یاد رکھنا، حالاں کہ معلوم نہیں کہ وہ رد ہوئیں یا قبول۔

(٣) کسی شخص کا دنیاوی ترقی کے معاملے میں اپنے سے بڑھے ہوئے پر نظر رکھنا اور دینی حیثیت پر اپنے سے کمتر کو دیکھنا۔

اور سعادت کی چار علامتیں ہیں: (١) پچھلے گناہوں کو یاد رکھنا۔ (٢) اور پچھلی نیکیوں کو بھول جانا۔ (٣) اور دین پر اپنے سے بڑھے ہوئے کو دیکھنا۔ (۴) اور دنیا کے لحاظ سے اپنے سے کمتر کو دیکھنا۔

تشریح: آپ کی ہر بات ہر نصیحت ہر تنبیہ انسانوں کے لیے انتہائی مفید دنیا و آخرت میں اس کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے، کاش کہ لوگ اس پر عمل کریں، آپ نے اس حدیث میں بد بختی کی چار نشانیاں ذکر فرمائی ہیں: (١) انسان کا اپنے ماضی میں کی گئی برائیوں اور گناہوں کو بھلا دینا اس پر ندامت اور معافی اور استغفار نہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ اتنی مدت گزر گئی شاید اللہ تعالی بھول گئے ہوں گے، ان کے پاس میرا ماضی کا ریکارڈ محفوظ نہ ہوگا، لہٰذا کوئی محاسبہ نہیں ہوگا،

حالاں کہ اللہ کے یہاں اس کے کیے ہوئے اعمال اور گناہ سب کے سب کلی طور پر اس طرح محفوظ ہیں کہ کوئی چھوٹا بڑا گناہ ایسا نہ ہوگا کہ صورت مثالی میں وہاں موجود نہ ہو۔ جس کو یہ کھلی آنکھوں سے دیکھے گا، اس لیے قرآن پاک میں ہے: "ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید" جو بات منہ سے نکلی ہے، اس کو محفوظ کرنے کے لیے ایک مستعد فرشتہ موجود رہتا ہے، جو اس کا رکارڈ رکھتا ہے۔ "لا یغادر صغیرۃ و لا کبیرۃ الا احصاھا" بہرحال جب ہر فعل وقول محفوظ ہے، تو پھر ان کو بھلا دینا اور ان کو معاف نہ کرانا، مغفرت نہ چاہنا، توبہ نہ کرنا، بہت بڑی کوتاہی ہے، اگر ان کے موجود ہونے کا یقین ہوگا تو توبہ کی توفیق ہوگی۔

دوسری بدبختی کی علامت یہ ہے کہ آدمی ماضی کی حسنات کو یاد کرکے اپنے اوپر غور کرے کہ میں نے گزشتہ زمانہ میں کیا کیا نیک کام کیے ہیں؟ ان کی بنیاد پر میری ضرور بخشش ہوگی؟ میری آخرت میں پذیرائی ہوگی؟ بے پناہ ثواب ملے گا؟ میں تو ماضی کی حسنات کی وجہ سے دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں، لوگ میری تعریف کرتے ہیں، عزیز رکھتے ہیں، جب دنیا میں یہ مقبولیت ان اعمال حسنہ کی وجہ سے ہے، تو آخرت میں بھی ضرور ان حسنات نے شرف قبول حاصل کیا ہوگا۔ حالاں کہ اس کو کیا پتہ کہ وہ خدا کے یہاں قبول بھی ہوئے یا قبول نہیں ہوئے، ہوسکتا ہے ریاکاری اور دنیا کو دکھلانے اور شہرت اور دنیاوی مقبولیت حاصل کرنے کی نیت کی وجہ سے وہ سب اعمال جن پر یہ تکیہ کیے بیٹھا ہے، سب اکارت ہو چکے ہوں، اور ان پر کوئی اجر وثواب ہی مرتب نہ ہوا ہو، اس لیے ہر اچھے عمل کے بعد ڈرتے رہنا چاہیے، کہ نہ معلوم قبول ہوا یا نہیں، اللہ نے اس کو خالصتاً اپنے لیے سمجھا بھی یا نہیں، کہیں ریا تو اس میں شامل نہ ہوگئی ہو۔ اگر انسان کو یہ خوف لگا رہے گا تو وہ کبھی بھی اس میں ریا کو دخل نہ دے گا صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا، اور پھر بھی ڈرتا رہے گا، تو اللہ تعالیٰ انشاء اللہ ضرور اس کے ماضی کے اعمال حسنہ کو قبول فرمائے گا۔

تیسری بدبختی کی علامت یہ ذکر کی گئی ہے کہ دنیاوی ترقی اور خوش حالی کے معاملے میں انسان اپنے سے زیادہ مال داروں اور ترقی یافتہ لوگوں کی طرف دیکھے اور اپنے کو ان سے کم تر دیکھ کر اللہ سے شکوے شکایت میں مبتلا اور ناشکری اور احساس کمتری میں مبتلا ہو، اور اس کو جو نعمتیں ملی ہوئی ہیں، ان کو ہیچ اور معمولی جانے، اور اپنے سے زیادہ مال والوں پر للچائی نگاہ ڈالے جب کہ اس سے بھی کم تر زندگی گزارنے والے لاکھوں اس کے سامنے ہیں، جن کے

مقابلے میں یہ خدا کے فضل سے بہت اچھے حال میں ہے: اس کو تو اپنے سے کم تر مال والوں کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ میں ان سیکڑوں غریبوں کے مقابلہ میں خدا کے فضل سے اچھے حال میں ہوں۔ اس سے اس کو حوصلہ ملتا، اطمینان ہوتا، خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر ہوتی اور شکر کے جذبات پیدا ہوتے، تو اللہ اس شکر کے نتیجہ میں اس کو مزید عطا فرماتے، جیسا کہ شکر پر اس کا وعدہ ہے: ''لئن شکرتم لأزیدنکم''۔

چوتھی بد بختی یہ ہے کہ دین اور دینی اعمال اور دینی زندگی کے باب میں انسان اپنے سے کم تر دین پر عمل والوں کو دیکھتا ہے کہ وہ دینی اعمال میں اس سے بھی کم درجے کے ہیں، ان کی غفلتیں اس سے بڑھی ہوئی ہیں۔

یہ دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ میں بہت اچھا ہوں، دیکھو لوگ مجھ سے بھی بدتر اور عمل میں کوتاہ ہیں: جب کہ میں ان سے کتنا اچھا ہوں۔ اس سوچ کے نتیجے میں اس میں فخر اور خود پسندی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی اتنی ہی حالت پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس کی روحانی ترقی رک جاتی ہے، وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اب اس سے زائد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں تو بہت سے ان لوگوں سے آگے ہوں جو مجھ سے پیچھے ہیں، یہ جذبات اس کو ترقی سے مانع ہوتے ہیں: اس کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے سے اچھے بڑے بڑے اعمال کرنے والوں کو دیکھتا، اور پھر اپنی کوتاہی پر نظر کرتا، کہ دیکھو لوگ اتنی مشغولیتوں کے باوجود کیسے کیسے نیک اعمال کر رہے ہیں، کیسے کیسے کار خیر میں حصہ لے رہے ہیں، اور میں باوجود فرصتوں کے ان اعمال میں کوتاہ ہوں تا کہ اس کو مزید نیکیاں کرنے کا حوصلہ ملتا، اُمنگ پیدا ہوتی، کوتاہی پر افسوس ہوتا، تو بہ کی توفیق ملتی۔ اللہ فرماتے ہیں، کہ میں نے بندے کی طرف توجہ کی لیکن بندہ متوجہ نہ ہوا تو میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹالی۔

بندے کو ہر وقت اپنے اللہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے، نا معلوم کس وقت ان کی خصوصی توجہ ہو، اور بندہ اس وقت غافل ہو تو محروم ہو جائے گا۔

صوفیا کا تو کہنا ہے: جس دم غافل اس دم کافر۔

بائد کہ غافل ازاں شاہ نہ باشی   شائد کہ نگاہے کند آگاہ نہ باشی

حدیث (۷) اچھائی کے چار بنیادی زینے

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ (اُصُوْلُ) الْاُمَّھَاتِ اَرْبَعٌ: (۱)اُمُّ الْاَدْوِیَةِ (۲)وَاُمُّ الْآدَابِ (۳)وَاُمُّ الْعِبَادَاتِ (۴)وَ اُمُّ الْاَمَانِیْ. فَاُمُّ الْاَدْوِیَةِ قِلَّةُ الْاَکْلِ، وَ اُمُّ الْآدَابِ قِلَّةُ الْکَلَامِ، وَ اُمُّ الْعِبَادَاتِ قِلَّةُ الذُّنُوْبِ، وَاُمُّ الْاَمَانِیْ الصَّبْرُ. (منبہات) ص/۳۱

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، کہ مائیں (اصول) چار ہیں: (۱) دواؤں کی ماں (اصل)۔ (۲) آداب کی ماں (اصل)۔ (۳) عبادت کی ماں۔ (۴) آرزوؤں کی ماں (اصل)۔۔۔ پس دواؤں کی اصل کم کھانا ہے۔ اور آداب کی اصل کم بولنا۔ اور عبادات کی اصل گناہوں کا کم کرنا۔ اور آرزوؤں کی اصل صبر ہے۔

تشریح: سب سے بڑی دوا کم کھانا ہے، اور سب سے بڑا ادب کم بولنا ہے۔ سب سے بڑی عبادت گناہوں سے بچنا ہے۔ اور سب سے بڑی آرزو صبر کرنا ہے۔ جس شخص کو یہ چار نعمتیں حاصل ہو جائیں، اس کے نیک اور صالح ہونے میں کیا شک ہے۔ کم کھانے میں صحت کا راز ہے، کم خور ہمیشہ صحت مند رہتا ہے، غذا میں بے اصولی اور بسیار خوری ہی آدمی میں مختلف امراض کے پیدا ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ معدہ تو منکی ہے، اگر اس میں گندگی یا زہر پیدا ہوگا، تو وہ خون کے ذریعے سارے بدن میں سپلائی ہوگا، اور پورے بدن کو خراب کر دے گا۔ معدہ تو طباخ ہے، اگر طباخ کھانے کو کچا رکھے، یا اجزا میں غیر ضروری اضافہ کر دے تو کھانا بدمزہ اور مضر ثابت ہوگا، اس لیے معدہ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالنا چاہیے۔

بھوک باقی رکھ کر کھائیں، خوب چبا کر کھایا جائے اور جب تک خوب بھوک نہ لگے تب تک نہ کھائیں، کھانے کے بعد تھوڑی دیر میں بار بار نہ کھائیں۔ یہ سب باتیں معدہ کے لیے مضر ہیں، اور معدہ خراب ہوا تو سمجھو پورا بدن خراب ہو جائے گا۔

سب سے بڑا ادب کم بولنا ہے: زیادہ بولنے سے وہ باتیں بھی بولی جاتی ہیں جو گناہ

کا باعث ہوتی ہیں۔ غیبت، جھوٹ، چغلی، سرزد ہو جاتی ہیں، زیادہ بولنے سے دل مرجاتا ہے۔

دل زبس گفتن بمیرد در بدن — گرچہ گفتارش در بود در عدن

زیادہ بکواس سے چہرے کی رونق ختم ہو جاتی ہے، زیادہ بولنے والے کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے، زیادہ بولنے والا باتونی اور قوال ہو کر رہ جاتا ہے، وہ فعال نہیں ہوتا، کام کرنے میں مستعد نہیں ہوتا۔ زیادہ بولنے والا بے حیا بھی ہو جاتا ہے، زیادہ بولنے والے سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں، جن سے اس کو رجوع کرنا پڑتا ہے، اور رسوائی ہوتی ہے، معافی مانگنی پڑتی ہے، زیادہ بولنے والے سے مصروف لوگ بھاگتے ہیں، لوگ اس کو چیکو کہتے ہیں، زبان ایک ایسا عضو ہے، کہ یہ بولتا ہے، اور غلطی کرتا ہے، تو اس کی سزا سارے بدن کو پٹائی کی شکل میں بھگتنی پڑتی ہے، زبان تو گالی دے کر بتیس (۳۲) دانتوں کے پھاٹک میں بند ہو جاتی ہے، تو پھر پورے بدن کو اس کی پاداش میں پٹائی کھانی پڑتی ہے، اسی لیے حدیث میں ہے، کہ ہر صبح سارے اعضا زبان سے پناہ مانگتے ہیں، کہ دیکھ تو ٹھیک چلنا ورنہ ہماری مصیبت ہے۔

مشہور واقعہ ہے: تالاب سوکھنے پر دو بگلے ایک لکڑی میں کچھوے کو لٹکا کر دوسرے تالاب کی طرف اڑا کر لے جا رہے تھے، اور اس کو نہ بولنے کی تاکید کر دی تھی، مگر بول پڑا، تو نیچے گر گیا۔

انٹرویو میں عموماً زیادہ بولنے والے ہی فیل ہوتے ہیں، جب کہ جتنا پوچھا جائے صرف اتنا ہی بولنا چاہیے۔

تیسری نصیحت یہ ہے کہ عبادات کی جڑ گناہ سے بچنا ہے: اس لیے کہ کتنی ہی عبادت کر لو جہاں گناہ کیے کہ سب عبادت چلی جاتی ہے، اکارت ہو جاتی ہے: چناں چہ حدیث میں ہے، کہ قیامت میں سب عبادت گزار لائے جائیں گے، مگر ان کے اوپر دوسروں کے مظالم کا بوجھ ہوگا، اس کے بدلہ میں ان کی عبادت کا ثواب مظلومین کو دلا دیا جائے گا، اور وہ خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ معلوم ہوا کے گناہ سے بچنا ضروری ہے، ورنہ عبادت کا نفع بھی حاصل نہ ہوگا، گناہ سے عبادت کا مزہ بھی ختم ہو جاتا ہے، گناہ گار کی عبادت کا کیف جاتا رہتا ہے، عبادت کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ بعض مرتبہ تو گناہوں کی وجہ سے عبادت کی توفیق بھی سلب کر لی جاتی ہے، دل پر سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے، دل گناہ کی نحوست سے مردہ ہو جاتا ہے، پھر کوئی عبادت

اس کو زندہ نہیں کر پاتی، جب تک کہ سچی توبہ نہ کر لے: اس لیے نفس وشیطان کے اغواء سے گناہ ہو جائے، تو فوراً توبہ کرنی چاہیے اور فوراً کوئی نیک کام کر لینا چاہیے، اس لیے کہ "إنّ الحسنات يذهبن السيئات" نیکیاں بدیوں کو ختم کر دیتی ہیں، مگر وہ گناہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو، وہ تو اس وقت تک ختم نہیں ہوتے، جب تک صاحب حق کا حق ادا نہ کر دیا جائے، یا اس سے معاف کرا لیا جائے۔ کسی کا دل دکھا کر کوئی بھی دنیا میں سکھی نہیں رہ سکتا، آج نہیں تو کل اس کی سزا پائے گا۔

چوتھی بات آرزوؤں کی جڑ صبر ہے، ساری آرزوئیں دنیا میں کس کی پوری ہوتی ہیں؟ آدمی کی تمنائیں اتنی ہوتی ہیں جن کا اختتام ہی نہیں، بڑھاپے میں یہ اور بڑھ جاتی ہیں، خصوصاً مال اور عمر کی زیادتی اس لیے اس غم سے چھٹکارے کا بہترین علاج صبر وقناعت ہے، یہ اتنی بڑی نصیحت ہے کہ دنیا میں اس سے بڑی کوئی نصیحت نہیں، صبر وقناعت انسان کو اطمینان کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں، اور ساری فکروں اور غموں سے نجات دلاتے ہیں اور صبر وہ ہے جو "عند صدمة الأولى" ہو ورنہ آخر کار تو سب کو ہی صبر آ جاتا ہے۔

حدیث (۸)

انسانی جسم میں چار ایسے جوہر ہیں جنکو چار چیزیں زائل کر دیتی ہیں

قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَرْبَعَةُ جَوَاهِرَ فِي جِسْمِ بَنِيْ آدَمَ يُزِيْلُهَا أَرْبَعَةُ أَشْيَاءَ: أَمَّا الْجَوَاهِرُ (١) فَالْعَقْلُ (٢) وَ الدِّيْنُ (٣) وَ الْحَيَاءُ (٤) وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ فَالْغَضَبُ يُزِيْلُ الْعَقْلَ وَ الْحَسَدُ يُزِيْلُ الدِّيْنَ وَ الطَّمَعُ يُزِيْلُ الْحَيَاءَ وَ الْغِيْبَةُ تُزِيْلُ الْعَمَلَ الصَّالِحَ. (منبہات) ص / ۳۶

ترجمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: انسان کے جسم میں چار جوہر ہیں، جن کو چار چیزیں زائل کر دیتی ہیں، جواہر یہ ہیں: (۱) عقل (۲) دین (۳) حیا (۴) عمل صالح ہیں۔ غصہ عقل کو اور حسد دین کو اور طمع حیا کو، اور غیبت عمل صالح کو زائل کر دیتی ہے۔

تشریح: انسان میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی اعلیٰ صفات پیدا فرمائی ہیں، جو درحقیقت انسان میں مثل جواہر کے ہیں، جن سے انسان مجلّی ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کی شخصیت نکھرتی اور عزت پاتی ہے، نیز دنیا و آخرت میں عزیز کہلاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ ان اوصاف میں سے کوئی وصف ختم ہو جائے تو انسان اتنی ہی مقدار میں ناقص اور خالی رہ جاتا ہے، پھر اس سے وہ افعال و حسنات صادر نہیں ہوتے جو اس صفت کے جوہر سے سرزد ہوتے تھے، یہ صفات درحقیقت وہ ملکات اور کیفیات ہیں، جو ہر خیر کے صدور کا باعث بنتے ہیں، اگر برے جذبات بری صفات اور رذائل ان اعلیٰ ملکات اور کیفیات کو ختم کردیں تو پھر انسان ان سب خوبیوں اور بلندیوں سے محروم ہو جاتا ہے، جن کے حصول کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے پیغمبر علیہ السلام نے ان برائیوں کی نشاندہی فرمادی ہے، جو ان اچھائیوں کو ختم کرنے کا ذریعہ ہیں، تاکہ انسان اپنے آپ کو ان سے بچانے کی پوری کوشش کرے۔ درحقیقت برائیاں وہ جراثیم ہیں، وہ وائرس ہیں، وہ بیکٹیریا ہیں، جن سے وہ اخلاقی و روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں، جو انسان کی روحانی و ربانی صحت کو نقصان پہنچاتی ہیں، جس کی وجہ سے بندہ جنت کے استحقاق سے محروم ہو جاتا ہے۔

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غصہ اور غضب انسان کی عقل کے جواہر کو معطل کردیتا ہے، جس سے وہ برائی اور اچھائی، نیکی و بدی، فرمانبرداری اور نافرمانی میں فرق کرتا ہے، غصہ آتے ہی سنجیدگی سے سوچنے کی حس دب جاتی ہے، اور انسان کنٹرول کھودیتا ہے: پھر اس کا ہر قول و فعل غلط سمت کی طرف مائل ہو جاتا ہے، صحیح سوچ اتنے وقت کے لیے ختم ہو جاتی ہے، معلوم ہوا غضب عقل کو زائل کردیتا ہے۔

اسی طرح ایک بیماری حسد ہے، حسد غضب کا پوتا ہے، اس لیے کہ غضب کے نتیجے میں انسان میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، لیکن جب انتقام نہیں لے پاتا، تو پھر اس شخص سے کینہ رکھنے لگتا ہے، اور گویا کینہ غضب کا بیٹا ہے، اور کینہ جب بڑھ جاتا ہے، تو دشمنی حد کو پہنچ جاتی ہے، تو پھر انسان اپنے مغضوب اور دشمن کی نعمتوں کے زوال کی تمنا کرتا ہے، یہی تمنا حسد کہلاتی ہے، تو گویا حسد پوتا ہے، اس کا باپ کینہ ہے، اور اس کا دادا غصہ ہے۔ حسد کے بارے میں فرمایا گیا: کہ وہ دین کو زائل کردیتا ہے۔ دین جو انسان کا سرمایا اور مدار نجات اور

خوشنودیٔ رب کا ذریعہ ہے، حسد اس کو ختم کر دیتا ہے، اس لیے کہ حسد براہِ راست اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو معاذ اللہ غلط گردانتا ہے، اللہ نے جس بندے کو اپنی نعمتوں، بلندیوں، عزتوں، مقبولیتوں، سرفرازیوں سے نوازا ہے، یہ حاسد ان کا زوال چاہتا ہے۔ یا تو یہ چاہتا ہے کہ اس سے زائل ہو کر اس کو مل جائے اور وہ محروم ہو جائے۔ یا یہ چاہتا ہے کہ وہ نعمت چاہے مجھے نہ ملے، میرے محسود کے پاس قطعاً نہ رہے۔ ظاہر ہے یہ اللہ کی عطا، بخشش اور فیصلہ کے ساتھ مقابلہ ہے، جو خدا کو قطعاً پسند نہیں، اس کی اس تمنا اور حسد سے، اس کا دین جو خدا پرستی اور خدا کے فیصلے اور قانون پر پورا اعتماد رکھنے سے عبارت ہے، وہ ہی مشکوک، بل کہ زائل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک انسان کا بڑا زبردست نقصان ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لالچ حیا کے زوال کا ذریعہ ہے: لالچ اور طمع ایک ایسی خصلت ہے، جو آدمی کی ایک بہت بڑی خوبی حیا، خودداری، قناعت اور خودی کے پرخچے اڑا دیتی ہے، وہ اس کو اتنا ذلیل اور رسوا کر دیتی ہے کہ وہ ادنیٰ آدمی کے سامنے بھی اپنی خودداری کو معمولی موہوم نفع اور خواہش کے لیے پامال کرنے سے دریغ نہیں کرتا: ساری عزت خاک میں مل جاتی ہے: حیا جو ایک ایسا وصف اور جوہر ہے، جس سے آدمی ضبطِ نفس کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، طمع کی وجہ سے اس جوہر سے محروم ہو جاتا ہے۔

ایک بیماری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت ہے، جو عمل صالح کو ختم کر دیتی ہے، عملِ صالح ہی تمام پاکیزہ جذبات اور کلمات کو خدا کے پاس آسمانوں پر پہونچانے کا ذریعہ ہے، پاکیزہ کلمات اللہ کے پاس پہنچتے ہیں، اور عملِ صالح ان کلمات کو اللہ تک پہنچاتے ہیں۔ "**إليه يصعد الكلم الطيب و العمل صالح يرفعه**" اور غیبت جب عملِ صالح ہی کو ختم کر دے گی، تو پھر عملِ صالح، کلماتِ طیبہ، حسنات کو اللہ تک کیسے لے جائے گا، غیبت کیوں کہ ایک مؤمن کی ایذا رسانی اور اس کی پردہ دری ہے، جو اللہ کو بے انتہا ناپسند ہے، لہٰذا اس کی نحوست سے غیبت کرنے والے کے اعمال صالحہ حبط ہو جاتے ہیں۔

حدیث (۹) قیامت کے دن چھٹکارا ناممکن

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَحْتَجُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَرْبَعَةِ أَنْفُسٍ عَلٰى أَرْبَعَةِ أَجْنَاسٍ مِّنَ النَّاسِ، عَلَى الْأَغْنِيَاءِ بِسُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَعَلَى الْعَبِيْدِ بِيُوْسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَعَلَى الْمَرْضٰى بِأَيُّوْبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَعَلَى الْفُقَرَاءِ بِعِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ. (منبہات) ص۳۵

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چار لوگوں پر چار شخصوں سے حجت قائم کرے گا، مالداروں پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ، اور غلاموں پر حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعہ، بیماروں پر حضرت ایوب علیہ السلام کے ذریعہ، اور فقراء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ۔

تشریح: عام طور پر آدمی اللہ کی عبادت نہ کرنے کے لیے چار امور کو حجت بناتا ہے: کبھی آدمی مالدار ہوتا ہے، مالداری کی وجہ سے اس کو اتنی مشغولیت پیش آتی ہے کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی، کارخانے جاتا ہے، کہیں نوکروں کی نگرانی کرنی ہے، کبھی ملازمین کو تنخواہ بانٹنی ہے، کبھی مالِ تجارت مارکیٹ بھیجنا ہے، پھر حساب و کتاب کرتا ہے، خریداروں کو کمپنی دینی ہے، کبھی کسی تقریب میں جاتا ہے، کبھی حکومت کو ٹیکس دینے اور اس کی کاغذات کی تیاری، یہ سب مالدار کی ایسی مشغولیت ہیں، جن کو بہانا بنا کر، وہ اللہ کی عبادت اور دین کے کاموں کو چھوڑ دیتا ہے، یا ان میں کوتاہی کرتا اور اپنی دانست میں اس کو بہت بڑا عذر سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے مالدار کے اعذار کو سن کر، اس کے خلاف بطور حجت کے، حضرت سلیمان علیہ السلام کو پیش کریں گے، کہ ان کی مالداری، حکومت اور مصروفیات تم سے ہزار گنا زیادہ تھیں، پھر ان کو کیسے عبادت اور دینی کاموں کے لیے وقت ملتا تھا، تم تو ان کے مقابلے میں بہت کم مصروف تھے، پھر تم نے کیوں عبادت اور دین کے کاموں میں حصہ نہیں لیا، معلوم ہوا تمہارا عذر، عذرِ لنگ ہے۔

اگر کوئی غلام یا ملازم اپنی ملازمت اور اپنے افسر اور آقا کی ملازمت کا عذر پیش کرے گا کہ میں تو ادنٰی ملازم یا غلام تھا، آقا کی خدمت اور اس کے احکام کی بجا آوری سے مجھے فرصت ہی نہیں ملتی تھی، کہ میں عبادت کرتا، یا دینی کاموں میں ہاتھ بٹاتا تو اس کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال لائی جائے گی، کہ وہ بھی غلام بنائے گئے تھے، ان سے بھی کام لیا جاتا تھا، پھر وہ کیسے وقت نکال کر اللہ تعالٰی کی عبادت اور دینی دعوت کا کام کرتے تھے، معلوم ہوا تم کو کرنا ہی نہیں تھا، تمہارا غلامی کا عذر، عذر لنگ ہے۔

اگر کوئی اپنی بیماری کو، عبادت چھوڑنے کی وجہ جواز بنائے گا، کہ مرض نے مجھے مہلت ہی کہاں دی کہ میں عبادت کرتا، اور دینی خدمت انجام دیتا، تو اس کے سامنے حضرت ایوب علیہ السلام کی مثال لائی جائے گی کہ ان کی بیماری کتنی سخت تھی، جسم بالکل نڈھال اور زخموں سے چور اور گوشت گل گیا تھا، حتیٰ کہ بدن کے ریشے ریشے سے خون اور پیپ رستی تھی۔ کیڑے پڑے گئے تھے، ٹیس وجلن اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، اور دوا دارو، یا طبیب اور خادم بھی نہیں تھا، پھر بھی ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کے ذکر اور یاد سے غافل نہ ہوئے، تیری بیماری تو اس درجے کی نہ تھی، پھر بھی تو فرائض تک ادا نہیں کرتا تھا، معلوم ہوا تو جھوٹا ہے، تیرا عذر بیماری یہاں نا قابل قبول ہے۔

اگر کوئی غربت اور ناداری اور دوسرے وسائل حیات اور ضروریات زندگی نہ ہونے کو عبادات سے غفلت اور دینی کاموں میں حصہ نہ لے سکنے کو حجت بنائے گا، تو اللہ تعالٰی اس کے خلاف حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دکھلائیں گے کہ دیکھو ہمارے یہ بندے زاہد اور تارک دنیا تھے، ان کے پاس مکان بھی نہ تھا، سامان بقدر ضرورت بھی مہیا نہ تھا، زیادہ تر سفر میں رہتے، پھر بھی اس عسرت اور تنگ حالی کے ہماری عبادت اور ذکر میں سب سے آگے تھے، کیا تمہارا عسر اور اسباب کی قلت ان سے بھی کم تھی؟ ہرگز نہیں، پھر تم نے ہماری یاد کے لیے وقت کیوں نہ نکالا؟ معلوم ہوا تمہارا عذر لنگ ہے، تم سزا کے مستحق ہو۔

ان مثالوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ تم عمل میں کوتاہی کے لیے کسی بھی عذر کو بطور حجت پیش نہیں کر سکو گے: اس دنیا میں ہر قسمی عذر والے موجود رہیں، مگر انہوں نے اللہ کی عبادت، فرماں برداری، اللہ کی یاد اور دین

کے کاموں میں سستی نہیں برتی؛ ساری مشغولیات، بیماریوں، غربتوں اور ملازمتوں اور ڈیوٹیوں میں بھی اللہ کی یاد اور اس کی عبادت کے لیے وقت نکال لیا ہے۔ پھر تم ان سے کم درجے کے اعذار کو اپنی کوتاہی کے لیے کیسے حجت بنا سکو گے؛ اس لیے یاد رکھو! دنیا کی ضرورت، جھمیلے، بیماری، دُکھی، مشغولیت بھی چلتی رہتی ہے اور انہیں سب مصروفیات میں سے اگر انسان چاہے اور اللہ کے احسان کا استحضار کرے یا اس کی حاکمیت اور گرفت کو سامنے رکھے، تو وقت نکال لینا دشوار نہیں، بل کہ ایسے بہ ظاہر اعذار رکھنے والوں کا وقت نکال کر عبادت کرنا، اللہ کے یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور اس کے دنیاوی کاموں میں برکت دے دی جاتی ہے۔ مصروف شخص کی عبادت کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو ترغیب ملتی ہے، ان کو بھی حوصلہ ملتا ہے، لہٰذا ان کے اس کو دیکھ کر عمل کرنے پر اس کو ان کے عمل کا بھی سبب بننے کی وجہ سے ثواب ملے گا؛ اس طرح اس کا ثواب ڈبل ہو جائے گا، اللہ کی خوشنودی کی وجہ سے ٹوٹے گھاٹے سے بچ جائے گا، دل جمعی نصیب ہوگی، اولاد پر بھی اچھا اثر پڑے گا، وہ بھی اس کی مستعدی سے سبق لے گی۔

حدیث (۱۰) مصیبت پر صبر کا بے حساب اجر

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يُوْضَعُ الْمِيْزَانُ فَيُؤْتٰى بِأَهْلِ الصَّلٰوةِ فَيُوَفَّوْنَ أُجُوْرَهُمْ بِالْمِيْزَانِ، ثُمَّ يُؤْتٰى بِأَهْلِ الصَّوْمِ فَيُوَفَّوْنَ أُجُوْرَهُمْ بِالْمِيْزَانِ، ثُمَّ يُؤْتٰى بِأَهْلِ الْبَلَاءِ لَا يُنْصَبُ لَهُمْ مِيْزَانٌ وَلَا يُنْشَرُ لَهُمْ دِيْوَانٌ فَيُوَفَّوْنَ أُجُوْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ حَتّٰى يَتَمَنّٰى أَهْلُ الْعَافِيَةِ أَنْ لَوْ كَانُوْا بِمَنْزِلَتِهِمْ مِنْ كَثْرَةِ ثَوَابِهِمْ عِنْدَ اللّٰهِ. (منبہات) ص۳۷

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جب قیامت کا دن ہوگا، تو ترازو رکھی جائے گی، پھر نمازیوں کو بلایا جائے گا اور ان کو ترازو کے ذریعے تول کر پورا اجر دیا جائے گا۔

پھر اہلِ صوم لائے جائیں گے، وہ بھی ترازو کے ذریعے پورا بدلہ دیئے جائیں گے۔ پھر وہ لوگ لائے جائیں گے، جنہوں نے دنیا میں مشقتیں برداشت کی ہوں گی، ان کے لیے نہ تو ترازو لگائی جائے گی اور نہ نامۂ اعمال کھولے جائیں گے، بل کہ ان کو بلا حساب وکتاب پورا بدلہ دیا جائے گا، یہاں تک کے اہلِ عافیت، اُن کا ثواب دیکھ کر تمنا کریں گے، کہ کاش ہم اُن جیسے ہوتے۔

تشریح: قیامت کا دن کیوں کہ انصاف کا دن ہوگا، اور ہر شخص کو اس کے ہر عمل کا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ عبادتی ہو یا اخلاقی یا معاشرتی اور معاملاتی، پورا پورا بدلہ انصاف والی ترازو کے ذریعے تول کر دیا جائے گا، کوئی کمی بیشی نہ کی جائے گی، نہ ڈنڈی ماری جائے گی۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حشر کے میدان میں نمازیوں کو نماز کا، روزے داروں کو روزہ کا، بھرپور بدلہ، پورے انصاف کے ساتھ دیا جائے گا۔ اسی طرح اور دوسرے اعمالِ خیر کا بدلہ دیا جائے گا، کسی کے ساتھ ناانصافی یا کمی نہیں کی جائے گی، نہ کسی عمل کے بدلے سے محروم رکھا جائے گا، بل کہ ہر ہر عمل کا مکمل بدلہ دیا جائے گا۔

پھر وہ لوگ لائے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں تنگی برداشت کی، مظالم برداشت کیے، ناانصافیاں دیکھیں، بیماریوں اور ذہنی دباؤ کا شکار رہے، کبھی خوشی، کشادگی، فرحت اور صحت نصیب نہ ہوئی، مگر پھر بھی کبھی ان کی زبان پر شکوہ یا بے صبری اور خدا سے بے اعتمادی ظاہر نہ ہوئی، ہر وقت اللہ کی قضا پر راضی رہے، صبر وتحمل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔

ان لوگوں کو لایا جائے گا ان کے اعمال تولنے کے لیے کوئی ترازو نہ لگائی جائے گی، نہ ان کے اعمال نامے کھولے جائیں گے، بل کہ ان کو اس صبر ورضا پر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اتنا بدلہ کہ وہ اپنے اللہ سے خوش ہو جائیں گے، اور اس بھرپور اجر کا شکر بجالائیں گے۔ ان کا دنیاوی مشقتوں پر جو انہوں نے دنیا میں صبر کے ساتھ جھیلیں تھیں، اتنا کثیر اجر اور اتنی نعمتیں اور اللہ تعالیٰ کی بے پناہ خوشنودی کا فیصلہ سن کر وہ لوگ جو دنیا میں آسائیوں، مال و دولت اور خوش حال رہ کر گئے ہوں گے، وہ حسرت کریں گے، اور ان کو ان پر اتنا رشک ہوگا کہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی دنیا میں مصیبتوں میں رہے ہوتے، تو آج ان دائمی مسرتوں، نعمتوں اور اللہ کی خوشنودیوں سے سرفراز ہوتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں غریب، نادار، بیمار، مظلوم، اور بے سہارا لوگوں کے لیے بے پناہ تسلی ہے۔ نیز خوش حال اور مال داروں کو تنبیہ ہے کہ مفلوک الحال لوگوں کو حقیر نہ جانیں۔ قیامت میں وہ تم سے اچھے اور تمہارے لیے قابل رشک ہوں گے۔ نیز اپنی ان فانی خوشیوں پر غرہ نہ کریں، جنت کی نعمتوں کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

حدیث (۱۱) جنت میں لے جانے والے اعمال

عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ: مَوْقُوْفًا عَلَیْہِ اَوْ مَرْفُوْعًا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْلَا ادِّعَاءُ الْغَیْبِ لَشَہِدْتُ عَلٰی خَمْسِ نفرٍ اَنَّہُمْ اَہْلُ الْجَنَّۃِ، اَلْفَقِیْرُ صَاحِبُ الْعِیَالِ وَ الْمَرْاَۃُ الرَّاضِیُّ عَنْہَا زَوْجُہَا وَ الْمُتَصَدِّقَۃُ بِمَہْرِہَا عَلٰی زَوْجِہَا وَ الرَّاضِیُّ عَنْہُ اَبَوَاہُ وَ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ۔

حلیۃ منبہات

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا: کہ اگر غیب کا دعویٰ کرنا لازم نہ آتا، تو میں پانچ شخصوں کو جنتی ہونے کی بشارت دے دیتا: ایک وہ فقیر جو صاحب اولاد ہو۔ دوسرے وہ عورت جس سے اس کا شوہر خوش ہو۔ تیسرے وہ عورت جو اپنے شوہر کا مہر معاف کردے۔ چوتھے وہ شخص جس سے اس کے ماں باپ خوش ہوں۔ پانچویں گناہوں سے توبہ کرنے والا۔

تشریح: ایک بات تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہونے کے نہ تو مدعی تھے، بل کہ اس دعوے کے شائبے اور کسی بات سے اس پر کوئی استدلال نہ کرلے، اس سے بھی خائف رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صفت صرف اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے کہ نصوص میں صرف اللہ ہی کی ذات کو عالم الغیب کہا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض لوگ اپنی حالت یا اپنی نیکی خلوص محبت، اتباعِ شریعت کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے معلوم ہوتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بولتا تھا کہ یہ لوگ ضرور اپنے اعمال اور حالات کے اعتبار سے جنت میں جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو حتمی طور پر بطورِ دعوے کی بھی فرما سکتے تھے، لیکن ایک تو کوئی آپ کے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہ کرنے لگے۔ نیز جب تک صراحتاً وحی سے اطلاع نہ ملے، تب تک حتمی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نصوصِ شرعیہ کی روشنی اور مزاجِ شرع کو سامنے رکھ کر، نیز عادۃ اللہ اور اس کی اپنے بندوں سے محبت وحسنِ معاملہ پر منجانب اللہ بشارتوں پر اعتماد کر کے، نبی کسی بات پر شہادت دے دیتا ہے، یا بطورِ بشارت کوئی بات کہتا ہے، جو بوجہ پیغمبر ہونے کے قابلِ اعتماد اور قابلِ یقین ہوتی ہے۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ غریب جو صاحبِ عیال ہو اور باوجود غربت کے اپنے اہل وعیال کی اپنی مقدور بھر عیال داری کرتا ہے، اس گراں باری پر کوئی شکوہ زبان پر نہیں لاتا، صبر وسکون کے ساتھ اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر راضی رہتا ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اس ادا اور اس صبر وقناعت پر فرماتے ہیں کہ اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے اور وہ جنتی ہوگا، مجھے اللہ کی ذات سے پوری توقع ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ عورت جس سے اس کا شوہر خوش ہو، اس لیے کہ عورتوں میں عموماً کچھ کج روی اور تندخوئی ہوتی ہے، جو اکثر شوہروں کے لیے انقباض، بدمزگی، کوفت اور ناخوشی کا باعث بنتی ہیں۔ کبھی ان کی سستی، غفلت، بے توجہی، بچوں کے باب میں تربیت اور پرورش میں کوتاہی، صفائی ستھرائی میں کوتاہی، پکانے کھلانے میں بے ترتیبی، مہمان کی پذیرائی میں کمی، یا ساس خسر کو ایذا رسانی، یا ان کی خدمت میں فروگذاشت، یا شوہر سے زبان درازی وترش روئی، یا عدمِ التفات، یا بدخلقی اور اخلاقی کمزوری، دین داری، پردہ، نماز، روزہ اور تلاوت سے غفلت، یا زیادہ مانگے جانا، گھر کی اشیا، یا پیسے کا غلط استعمال یا اسراف، سنگار میں کوتاہی، یا حد سے زیادہ اس پر وقت اور پیسے کا ضیاع، نیز زیورات کی بڑھی ہوئی حرص: یہ سب اس قسم کی خصلتیں ہیں، جن کی وجہ سے عموماً شوہروں کو اپنی بیویوں سے شکوہ، ناراضگی یا کم از کم شکررنجی اور وقتی شکوہ ہو ہی جاتا ہے۔ اب اگر ان عمومی احوال میں کوئی بیوی اللہ کی بندی ایسی ہو، جو اپنے شوہر کی اتنی پسندیدہ ہو کہ شوہر کو اس

کی طرف سے کوئی ادنیٰ بھی شکایت نہ ہو، بل کہ وہ اس سے خوش وراضی ہو، اس کی ہر ادا اس کو بھاتی ہو، اس نے اس کو مکمل سکون بخشا ہو۔ نیز مزید براں اس عورت نے خوش دلی سے اپنا مہر بھی شوہر سے معاف کر دیا ہو، جس کی وجہ سے وہ اس قرض سے بھی فارغ البال ہو گیا ہو، تو ایسی عورت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کہ مجھے یقین ہے، بل کہ اگر میں اس کے حق میں شہادت بھی دے دوں، تو دے سکتا ہوں، کہ ایسی عورت جنتی ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ وہ شخص جس کے ماں باپ اس سے خوش ہوں: ماں باپ بڑھاپے کی وجہ سے فطری طور پر بعض ایسی باتیں یا کام کر بیٹھتے ہیں، یا ایسے کاموں کا مطالبہ کرتے ہیں، یا بیٹے کی بیوی کا شکوہ کرتے ہیں، یا بیٹے کی ساس یا سسر کی دخل اندازی کی وجہ سے ایسے مطالبے کرتے، جن باتوں پر بیٹے کو اپنے حالات یا بیوی کی رعایت یا ساس سسر کے ساتھ تعلقات اور تعاون کو برقرار رکھنے میں دشواری پیش آتی ہے: اس کے باوجود کوئی بیٹا ایسا ہو، جو ماں باپ کو ادنیٰ شکایت پیدا نہ ہو، نہ ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی ہونے دے، ان کی جائز فرمائشوں کو وقت پر خوش دلی سے پورا کرتا رہے، یہاں تک کہ وہ دونوں تنہائی میں نیز غیروں کے سامنے بھی بیٹے کی تعریف کرتے ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں شہادت دے سکتا ہوں، ایسا بیٹا انشاءاللہ جنت میں جائے گا۔

اسی طرح آپ نے فرمایا: جو شخص اپنے گناہوں سے توبہ کرتا رہتا ہو۔ بہ حیثیت بشریت کون شخص ہے؟ جس سے گناہوں کا صدور نہ ہوتا ہو۔ صغیرہ تو صغیرہ، انسان سے اکثر کبیرہ بھی شیطان سرزد کرا ہی دیتا ہے۔ کبھی خواہشِ نفس سے، کبھی مال کی حرص سے، کبھی بیوی بچوں کی خاطر، کبھی دوستوں کی خاطر، کبھی سماج کے دباؤں میں، کبھی غصے اور خوف میں بھی گناہوں کا صدور ہو جاتا ہے۔ مگر وہ فوراً اللہ کے سامنے اپنی غلطی اور گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے توبہ کر لیتا ہے، معافی کا طالب ہوتا ہے، شرمندہ ہو کر روتا دھوتا ہے، آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرتا ہے، اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو تیرے سب سے بڑے محسن ہیں، ان کی نافرمانی کی، ان کو ناراض کیا، تو قیامت میں ان کو کیا منہ دکھائے گا اور ان سے کیا شفاعت اور بخشش کی امید رکھے گا! ابھی وقت ہے، مرنے سے پہلے توبہ کر لے، معافی مانگ لے، آئندہ ایسا کرنے سے باز رہنے کا عہد کر لے۔ اگر یہ گناہ

حقوق العباد سے متعلق ہے، تو صاحب حق کا حق ادا کر دے، اُس سے معافی مانگ لے، کسی کا دل دُکھایا ہے، تو اس کو خوش کر لے۔ ابھی وقت ہے مرنے کے بعد یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا، اس کے تدارک کا ابھی موقع ہے۔ بہر حال جس کو گناہ کے بعد یہ توفیق مل جائے اور وہ جلد توبہ کا عادی بن جائے، اس لیے کہ زندگی میں گناہ تو کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے! اچھی بات ہے کہ فوراً اس کے بعد توبہ کر لے، توبہ اداللہ کو اتنی پسند ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایسے شخص کو بشارت دے دوں، بل کہ شہادت دے دوں، کہ وہ جنت میں جائے گا۔

حدیث نمبر (۱۲) اچھی چیزوں کی ناقدری کا وبال

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سِتَّةُ أَشْيَاءَ هُنَّ غَرِيبَةٌ فِي سِتَّةِ مَوَاضِعَ: اَلْمَسْجِدُ غَرِيبٌ فِيمَا بَيْنَ قَوْمٍ لَا يُصَلُّونَ فِيهِ، وَ الْمُصْحَفُ غَرِيبٌ فِي مَنْزِلِ قَوْمٍ لَا يَقْرَؤُنَ فِيهِ، وَ الْقُرْآنُ غَرِيبٌ فِي جَوْفِ الْفَاسِقِ، وَ الْمَرْأَةُ الْمُسْلِمَةُ الصَّالِحَةُ غَرِيبَةٌ فِي يَدِ رَجُلٍ ظَالِمٍ سَيِّئِ الْخُلُقِ، وَ الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ الصَّالِحُ غَرِيبٌ فِي يَدِ امْرَأَةٍ رَدِيَّةٍ سَيِّئَةِ الْخُلُقِ، وَ الْعَالِمُ غَرِيبٌ بَيْنَ قَوْمٍ لَا يَسْمَعُونَ إِلَيْهِ. ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نَظَرَ الرَّحْمَةِ. (منبہات) ص ر ۵۰

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ چھ چیزیں چھ مواقع پر اجنبی معلوم ہوتی ہیں: ایک وہ مسجد جو ایسی قوم میں واقع ہو جو اس میں نماز نہیں پڑھتے۔ دوسرے وہ قرآن ایسی قوم کے گھر میں ہو، جو اس کو نہیں پڑھتی۔ اسی طرح قرآن فاسق حافظ کے سینہ میں اجنبی ہے۔ چوتھے نیک مومنہ عورت، ظالم اور بد اخلاق آدمی کے قبضے میں اجنبی ہے۔ اور نیک

مومن مرد، کسی بد خلق عورت کے رفاقت میں اجنبی ہے۔ اور ایک عالم، اس قوم کے درمیان اجنبی ہے، جو اس کی بات نہ سنے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن، ان سب کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔

تشریح: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی چیز، اچھے لوگوں کی جو قدر ہے، ان کی قدر نہ کرنے والوں کو وعید سنائی ہے، کہ ایسی قیمتی، قابلِ نفع اور قابلِ نجات چیز۔ اسی طرح ایسے اعلیٰ اخلاق سے مزین اشخاص کے ہوتے ہوئے، ان سے نفع اٹھانا تو در کنار، ان سے اعراض اور ان کو تکلیف پہنچانا، اُن پر ظلم کرنا، کتنی بری بات ہے! ایسے لوگ اپنی ان ناقدریوں کی وجہ سے آخرت میں اللہ کی نظرِ رحمت سے محروم رہیں گے۔ جیسے وہ دنیا میں ان چیزوں اور ان اشخاص سے مستفع نہ ہوئے، محروم رہے، اور ان اسبابِ رحمت کو اختیار نہیں کیا، اور نہ ان کی قدر کی، تو ایسے لوگ آخرت میں خدائی رحمت سے بھی محروم رہیں گے۔

مسجد خدا کا گھر تھا، وہ محلے اور بستی میں موجود تھی، مگر ان لوگوں نے اس کو آباد نہ کیا، اس کو ویران رکھا، مسجد کو انہوں نے اجنبی سمجھا، اس کے ساتھ اجنبی جیسا برتاؤ کیا، مسجد بغیر مصلیوں کے خالی اور اجنبی پڑی رہی۔ ایسے ہی وہ قوم جن کے گھروں میں قرآن موجود ہے، مگر وہ اس سے اجنبیت برتتے ہیں، وہ اس کو تلاوت کی جانے والی کتاب نہیں سمجھتے، کبھی اس کو اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ ایسے ہی وہ حفاظ، جن کے سینے میں قرآن محفوظ تھا، اس عظیم دولت سے اللہ نے ان کو نواز رکھا تھا، مگر انہوں نے اس کو یاد نہ رکھا، اُس کی تلاوت چھوڑ دی، اس کو اجنبی بنالیا، گویا حافظ ہی نہیں ہے، نہ رات کو پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے، نہ دن میں؛ کتنی بڑی محرومی کی بات ہے! اگر یہ حفاظ یہاں دنیا میں قرآن کے ساتھ اجنبیت برتیں گے، تو کل قیامت میں قرآن پاک اُن سے لاتعلقی کا اظہار کر دے گا؛ پھر کتنی بڑی بے بسی کا عالم ہوگا، جو قرآن ان کے لیے حجت بنتا، اب وہ اُن کے خلاف حجت بن جائے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بد خلق اور ظالم شوہر کے نکاح میں صالحہ بیوی بھی اجنبیت کی زندگی گذارتی ہے، اس نیک اور صالح عورت کی شوہر کو قدر کرنی چاہیے تھی، اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہیے تھا، اُس کے برخلاف رات دن یہ ظالم اور بد خلق شوہر اس پر ظلم ڈھاتا اور اس کے حقوق سلب کر کے اس کی زندگی اجیرن بنائے رکھتا ہے، جس کی وجہ سے

گھر اور گھر کا ماحول اور شوہر اس کے لیے ایک اجنبی اور غیر مانوس بنے رہتے ہیں، اور وہ جس نے مانوسیت اور محبت اور دلداری کی خاطر اس گھر کو اپنایا تھا، اب زندگی کے ختم ہونے کی گھڑی گنتی رہتی ہے، تا کہ اس دُکھ کی زندگی سے نجات ملے۔

اسی طرح ایک صالح اور دین دار شوہر بد خلق اور برے اخلاق والی بیوی کے ساتھ ایک غیر مانوس اور اجنبیت کی زندگی گذارتا ہے، کوئی سکون اور سکھ اور اپنائیت اس کو ایسی بیوی سے نصیب نہیں ہوتی، وہ اپنی نرم دلی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کو برداشت کیے رہتا ہے، مگر بدخو عورت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ اس شوہر کی کوئی قدر نہیں کرتی، وہ بے چارہ گھٹ گھٹ کر اپنے دن پورے کرتا رہتا ہے۔

ایسے ہی وہ عالم بھی ایک اجنبی بنا رہتا ہے، جو ایسے سماج اور قوم میں رہتا ہو، جو اس کی کسی بھی نصیحت اور ہدایت کو سننے کی لیے تیار نہ ہوں، جب بھی وہ ان کی خیر خواہی اور اپنے فریضے "امر بالمعروف و النھی عن المنکر" کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ اس کی بات پر کان ہی نہیں دھرتے۔ ظاہر ہے، ایسی قوم اور ایسا معاشرہ جس عالم کو ملا ہو، وہ اس میں ایک نامانوس اور اجنبی ہی ہوگا، جس کا کوئی محرم راز اور شریک کار نہ ہو، وہ اپنے آپ کو اکیلا ہی سمجھے گا۔

اس قسم کے تمام اجنبی ماحول میں زندگی گذارنے والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دیتے ہوئے ان کے مخالف اور مقابل لوگوں کو سخت وعید سناتے ہوئے فرمایا: کل قیامت میں اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت کی نگاہ تک نہ ڈالیں گے، جس کے وہاں وہ بہت محتاج ہوں گے۔

حدیث (۱۳) جھوٹ کی نحوست

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْہُ الْمَلَکُ مِیْلاً مِنْ نَتْنِ مَاجَاءَ بِہٖ. رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ (مشکوٰۃ، ص/۴۱۳)

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب بندہ جھوٹ بولتا ہے، تو فرشتہ اس جھوٹ کی بدبو سے ایک میل دور بھاگ جاتا ہے۔

تشریح: جس طرح مادی چیزوں میں بدبو اور تعفن ہوتا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، لوگ اس بدبو سے ناک بند کرتے یا اس جگہ سے بھاگتے ہیں، گندے اور بدبودار شخص کو ملامت کرتے ہیں، اس کو صاف ستھرا رہنے کی ہدایت کرتے ہیں؛ اسی طرح معنوی اور اخلاقی برائیوں میں بھی بدبو ہوتی ہے، چاہے ہمارے مادی اعضا اس کو محسوس نہ کر پائیں، لیکن لطیف اور غیر مرئی اور پاکیزہ مخلوق، اس کا احساس کرتی ہے۔ چناں چہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے، تو اس کے منہ سے ایسی بدبو آتی ہے کہ فرشتہ اس کی بدبو سے ایک میل تک دور بھاگ جاتا ہے۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک برائی اور ایک گناہ کا بطور مثال تذکرہ فرمایا ہے، ورنہ تو ہر گناہ کے ارتکاب سے ایسی بدبو پھیلتی ہے کہ پاکیزہ مخلوق یعنی فرشتے اُس کی بدبو سے میلوں بھاگتے اور نفرت کرتے ہیں۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی معصوم اور پاکیزہ ولطیف مخلوق ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی فرماں بردار اور وفادار واطاعت شعار مخلوق ہے، ان کی ڈیوٹی انسان کی خدمت، ان کے تحفظ، راحت رسانی اور صحت رسانی؛ نیز انسان کے لیے ضروری اشیا اور امور کی دیکھ بھال؛ نیز اعمال کے لکھنے وغیرہ میں لگی ہوئی ہے۔ بعض فرشتے تو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور شیطانی حرکات سے اس کی اور اس کے اہلِ خانہ کی حفاظت کرتے ہیں، ایسی ہمدرد اور راحت رساں ومحافظین کو تکلیف پہنچانا، بڑی بد اخلاقی ہے۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں میں بدبو ہے، فرشتوں کو تو ادراک ہو جاتا ہے، انسانوں کو ادراک نہیں ہوتا، اگر ادراک ہونے لگے، تو

شرمندگی ہے۔ نیز دوسرے تو دوسرے، خود بھی انسان اپنے گناہوں کی بدبو کی وجہ سے کھانے پینے سے محروم ہو جائے گا، وہ تو اللہ تعالیٰ نے ستاری فرما رکھی ہے، یہ ان کا احسان ہے، ورنہ انسان رسوا ہو جاتا، اس لیے کہ ہر گناہ کی الگ قسم کی بدبو ہوتی، تو لوگ پہچان جاتے کہ یہ بدبو تو فلاں گناہ کی ہے۔ جو اللہ والے اور صاحب کشف ہیں، وہ گناہوں کی بدبو کا ادراک کر لیتے ہیں۔

حدیث (۱۴) قطع تعلق کا وبال

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ (مشکوٰۃ: ص/۴۱۹)

ترجمہ: جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، کہ انہوں نے کہا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، کہ رحم کا قطع کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

تشریح: صلہ رحمی خونی رشتے کا اولین فریضہ ہے، اگر کوئی صلہ رحمی نہ کرے بل کہ قطع رحمی کا مرتکب ہو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لیے زبردست وعید سنائی ہے، کہ ایسا شخص جنت میں نہیں جا سکتا، قطع رحمی کی پاداش میں جنت میں داخلہ اس کے لیے ممنوع ہوگا: رحم قیامت میں استغاثہ کرے گا، کہ میرا حق دلاؤ اور مجھ پر ظلم کی سزا دو، اے اللہ آپ رحیم ہیں اور میں رحم ہوں، دونوں کا مادہ ایک ہے، میں آپ سے اپنے حق کی فریاد کرتا ہوں، آج فریاد سننے کا دن ہے، آج تو ضرور سنی جائے گی، اور آپ سے بڑا کوئی منصف نہیں ہے، لہٰذا آپ میری دادرسی کیجیے۔ ظاہر ہے اس فریاد کے ساتھ جنت میں بلا بدلہ اور سزا پائے، داخلہ کیسے ہوگا، اللہ کے یہاں تو انصاف ہے۔ اس وعید کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو صلہ رحمی کرنے کی ترغیب اور نہ کرنے پر وعید سنائی ہے۔ خونی رشتہ کا خیال ولحاظ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اسی کی وجہ سے ماں باپ اولاد کی پرورش کرتے اور ان کے لیے ہر قسم

کی دقت و مشقت برداشت کرتے ہیں، اور اسی رشتہ کی وجہ سے اولاد ماں باپ پر فدا رہتی ہے، اور ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے کام آتا اور اس کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ شریعت نے بھی اسی خونی رشتہ پر ایک دوسرے کو میراث میں شریک کر کے درجہ بہ درجہ حصص مقرر فرمائے ہیں۔ لیکن مال کی حد سے بڑی حرص مادہ پرستی اور برے ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر بسا اوقات انسان انتہائی قریبی رشتے داروں سے کٹ جاتا ہے، دور ہو جاتا ہے، بل کہ ایک دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہے، ملنا جلنا چھوڑ دیتا ہے، غیروں کو پکڑتا پھرتا ہے، اور اپنوں سے بھاگتا ہے، اور اس میں زیادہ تر دخل، بیوی کو ہوتا ہے۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ قیامت میں اس بری خصلت پر باز پرس ہوگی اور جنت سے محرومی کا اندیشہ ہے: اس لیے دنیا میں نفس و شیطان اور بیوی کے سکھانے، پڑھانے میں آ کر قطع رحمی نہ کرو، ابھی بھی وقت ہے، ان سے معافی مانگ لو، جن کے حق میں زیادتی ہوئی ہے۔

حدیث (۱۵) ظلم و زیادتی کا انجام

عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ مشکوٰۃ ۴۲۱

ترجمہ: جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ رحم نہیں کرتا اس شخص پر جو لوگوں پر رحم نہ کرے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کیوں کہ انسان جیسی اشرف مخلوق کے بھی خالق اور مالک ہیں، اس لیے اس کو اپنی مخلوقات میں انسان سے سب سے زیادہ محبت ہے، اور دوسری مخلوقات کو اس نے انسان ہی کی خدمت اور نفع کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ یہ خود انسان کے اشرف اور محبوب ہونے کی دلیل ہے۔ انسانوں میں بعض کمزور، بیمار، ناقص الاعضا، مظلوم، نادار، بے سہارا، کم عقل، مفلوج اور قابلِ رحم ہوتے ہیں۔ اور بعض انسان طاقت ور، صحت مند، کامل الاعضا، با اقتدار، مال دار، عقل مند، بارسوخ اور باہمت قوی ہوتے ہیں، جس کے نشے میں بسا اوقات وہ ظالم

ہو جاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے با اقتدار، قوی، صحت مند، مال دار انسانوں کو کمزور، نادار انسان کے ساتھ رحم، شفقت اور تعاون کا معاملہ اور ان کی ہر قسمی مدد اور ان پر رحم کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اور فرمایا کہ تم کو اللہ نے یہ مقام اور مرتبہ وحیثیت عطا کی ہے، کہ تم مدد کرنے کے اہل ہو، تو اس انعام کے شکریہ میں تم کمزور انسانوں پر رحم وترس کھاؤ، اور ان کی مدد کرو، ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اُن پر ظلم مت کرو، اگر تم ان پر رحم نہیں کرو گے، تو وہ خدا جس نے تم کو قوی اور مال دار بنایا ہے، وہ تم پر رحم کرنا بند کر دے گا، جس کے نتیجے میں تمہاری ساری نعمت چھین جائے گی اور تم خود قابلِ رحم ہو جاؤ گے، اور کہیں وہ مظلوم اور نادار تمہاری طرح قوی اور مال دار بنا دیا جائے؛ اس لیے اس وقت کے آنے سے پہلے اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے، اس پر ترس کھاؤ اور اس کی مدد کرو، اور اس پر ظلم وزیادتی، اس کے حقوق دبانے سے اپنے آپ کو باز رکھو؛ اس طرح تم اللہ کی رحمت کے مستحق بنے رہو گے اور نادار بھی تمہارا ممنون، احسان وخیر خواہ اور دعا گو بنا رہے گا، جس سے تم کو امن وامان حاصل رہے گا، ورنہ اس کا بھی امکان ہے کہ سارے مظلوم جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں، یا ڈاکہ ڈال کر تمہارا مال چھین لیں اور تم پچھتاتے رہ جاؤ، چوں کہ تم کو یہ سزا اپنے کرتوتوں پر ملی ہوگی، تو اللہ بھی قطعاً رحم نہ کریں گے۔

حدیث (۱۶)

لوگوں کے ساتھ خیر خواہی علامت ایمان

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ.

(مشکوٰۃ: ص/۴۲۲)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کہ اس وقت تک بندہ کامل مومن نہیں ہوتا، جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرلے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

تشریح: کامل مومن اور پکا مسلمان، سچا بندہ وہ ہے، جو اگر اپنے لیے یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس سے جھوٹ نہ بولے، کوئی اس کی غیبت نہ کرے، کوئی اس کو نقصان نہ پہونچائے، کوئی اس کو دھوکہ نہ دے، لوگ اس کی عزت کریں، اس کو اہمیت دیں، اس کی تعریف کریں، اس سے محبت کریں، اس سے مشورہ کریں، اس کے ساتھ حسن سلوک کریں، تو اس کو چاہیے کہ یہ ہی سب باتیں اور برتاؤ وہ اپنے بھائی یعنی دوسرے آدمی کے لیے پسند کرے، یعنی ان کے ساتھ ایسا ہی اچھا برتاؤ کرے جیسا کہ وہ دوسروں سے خود اپنے لیے چاہتا ہے، اگر ایسا ہی برتاؤ سماج میں سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کرنے لگیں گے، تو ایک بہترین، مہذب اور پُر امن سماج وجود میں آئے گا، اور امن قائم ہوگا: اسی سے پتہ چلے گا کہ سارے انسان بھائی بھائی اور ایک ماں باپ یعنی آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو صادق ومصدوق ہیں، یہ بات وہ بلا قسم کھائے بھی فرمادیتے، تو بھی وہ سب کے نزدیک قابلِ قبول ہوتی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کی خاطر زور دیتے اور ان کو اس خصلت کی اہمیت بتلانے کے لیے اور ایمان کے اعلیٰ اور کامل درجے کی علامت کے طور پر اس کو ذکر فرمایا۔ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ وہ سچا، پکا اور کامل مومن بنے، تو اس کو اس کمال کو حاصل کرنے کے لیے "یحب لأخیہ مایحب لنفسہ" پر عمل کرنا ہوگا، ایسا کر کے جہاں وہ کامل مومن کہلائے گا، اور کمالِ ایمان کے ثواب اور مرضیاتِ خداوندی کا خوگر قرار پائے گا، وہیں وہ دنیا میں رہتے ہوئے اس خصلت سے دل میں ایک سرور، ایک اطمینان اور لوگوں کی طرف سے مقام محبوبیت پالے گا، جو اس کی دنیاوی زندگی کو بھی جنت بنادے گی۔

حدیث (۱۷) خیر خواہی پر اجر عظیم

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمَلَۃِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاَحْسِبُہٗ قَالَ کَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَکَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ۔ (مشکوٰۃ، ص/۴۲۱)

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیواؤں اور مسکین کے لیے جدو جہد کرنے والا یعنی ان کی کفالت کرنے والا ایسا ہے جیسے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا۔ راوی فرماتے ہیں: میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بیوہ اور مسکین کی کفالت کرنے والا ایسا ہے جیسے کوئی بلا تھکے رات بھر نماز پڑھتا ہے یا ہمیشہ روزے رکھتا ہے۔

تشریح: مخلوق اللہ کا کنبہ ہے "الخلق عیال اللہ أحب النّاس من أحسن الی عیالہ"۔ لہٰذا جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، ان کی مدد کرے، ان کی فکر کرے، اپنی کمائی میں ان کا حصہ رکھے، وہ شخص اللہ کو بہت محبوب ہے۔ خصوصاً سماج کے وہ لوگ جو غریب و بے سہارا ہیں، جیسے بیوہ اور مسکین، ان لوگوں کی خبر گیری، مدد و کفالت تو اور زیادہ اللہ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا محبوب صرف وہی بندہ نہیں ہے جو اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوں، یا رات بھر بلا کسی سستی کے مستعدی اور خلوص کے ساتھ نماز پڑھتا رہتا ہے، یا دائمی روزہ رکھتا ہے، بل کہ وہ شخص بھی اسی طرح اللہ کا محبوب ہے، جو مساکین اور بیواؤں کی خبر گیری کرتا ہو، ان کی ضروریات اور پریشانیوں کو دور کرنے کی جدو جہد کرتا ہو، سماج کے بے سہارا، مفلوک الحال لوگ، اسی طرح معذورین، لنگڑے، لولے، اندھے، بہرے لوگ، کسی مدد کے سخت محتاج ہیں، ان کی کفالت، دیکھ بھال، علاج اور تعلیم کی فکر بھی، نماز، روزہ و جہاد کے ثواب سے کم نہیں۔ اللہ کے یہاں نماز، روزے، جہاد کے اعمال کے بدلے کی طرح، ان اعمال پر بھی بھر پور بدلہ ملے گا۔ افسوس! لوگ انسانی خدمات کو وہ درجہ نہیں دیتے جو نماز، روزہ اور جہاد کو دیتے ہیں۔ اس لیے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اہمیت، فضیلت اور ثواب کو نماز، روزہ اور جہاد سے تشبیہ دے کر بیان کرنا پڑا، تا کہ سماج کے ان ضرورت مند، بے سہارا اور افتادزدہ لوگوں کو مشقت اور ناداری سے بچایا جا سکے اور ان کو ضروریاتِ زندگی مہیا کی جا سکیں۔

حدیث (۱۸) والدین کی نافرمانی کا انجام

عَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كُلُّ الذُّنُوْبِ يَغْفِرُ اللّٰهُ مِنْهَا مَاشَاءَ إِلَّا حُقُوْقَ الْوَالِدَيْنِ فَإِنَّهُ يُعَجِّلُ لِصَاحِبِهٖ فِي الْحَيَاةِ قَبْلَ الْمَمَاتِ. (مشکوٰۃ:ص/۴۲۱)

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام گناہوں میں سے جن کو چاہتا ہے، اللہ معاف فرما دیتا ہے، مگر ماں باپ کی نافرمانی کا گناہ، اللہ معاف نہیں کرتا، بل کہ اس کی سزا اللہ نافرمان اولاد کو مرنے سے پہلے دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔

تشریح: ماں باپ چوں کہ اولاد کے لیے سبب وجود ہیں؛ نیز اولاد ان سے خونی رشتہ رکھتی ہے، اس کی پرورش میں انہوں نے خون پسینہ بہایا ہوتا ہے، بڑے دُکھ درد ان کی پرورش کے دوران جھیلے ہوتے ہیں، اس کا تقاضا ہے، کہ ان کی بے پناہ رعایت کی جائے، ان سے محبت کی جائے، ان کی فرماں برداری کی جائے، ان کی خدمت کی جائے، ان کی تو زیارت بھی عبادت ہے، ان کے لیے دعا کرنے کو کہا گیا ہے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک پر بڑی بشارتیں سنائی گئی ہیں۔ اسی طرح ان کی نافرمانی، ان پر زیادتی، ان کی تکلیف دہی پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے، کہ ماں باپ کی نافرمانی کی سزا دنیا ہی میں، اولاد کو اپنی حیات ہی میں بھگتنی پڑے گی؛ یہ سزا آخرت تک اُدھار نہیں رکھی گئی، بل کہ دنیا ہی میں نقد دی جائے گی، تا کہ اولاد بھی دیکھ لے اور دوسرے سب لوگ بھی دیکھ لیں اور ان کو نافرمانی کا انجام معلوم ہو جائے۔

بعض گناہوں کی سزا آخرت میں دینا طے ہے، جیسے کفر، شرک۔ بعض گناہوں کی سزا آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں دینا بھی طے ہے: ان گناہوں میں سے ایک گناہ ماں باپ کی شرعی امور میں، جائز امور میں، واجب امور میں نافرمانی کرنا، ان کو اپنی نافرمانی، سخت کلامی یا بُرے برتاؤ سے تکلیف پہنچاتا ہے، ان کے مقابلہ میں بیوی کو ترجیح دیتا ہے۔ ماں باپ کو ستانے والے کو اس وقت تک موت نہیں آتی، جب تک وہ اپنی اولاد سے اس قسم کی نافرمانی اور تکلیف کا مزہ نہ چکھ لے۔

حدیث (۱۹) لڑکیوں کی پرورش پر اجر عظیم

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَ هُوَ هٰكَذَا وَضَمَّ أَصَابِعَهُ (مشکوٰۃ ص ۴۲۱)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں، ایسا شخص قیامت میں مجھ سے انگلیوں کے ملنے کی طرح قریب ہوگا؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیوں کو ملا کر دکھلایا۔

تشریح: یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کو منحوس سمجھا جاتا تھا، بل کہ پیدائش کے بعد زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اس کے زندہ رہنے کو اپنے لیے عار سمجھا جاتا تھا، جب کہ اس کا اس کے سوا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ صنفِ نازک کی اس مظلومیت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے غم کھایا اور لڑکیوں کی پرورش اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی تعلیم و تربیت پر اعلیٰ قسم کی بشارتیں سنائیں۔ فرمایا: ایسا شخص قیامت میں مجھ سے انتہائی قریب ہوگا، جنت میں میرے ساتھ ہوگا؛ اس سے زیادہ کسی کے لیے خوشی اور شرف کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو پیغمبر کا آخرت میں قرب نصیب ہو۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار صاحبزادیاں تھیں؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بے حد محبت کی، ان کی اعلیٰ پرورش کی، ساری زندگی

ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور عزت کا برتاؤ کیا، ان کو اپنے جگر کا ٹکڑا کہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام سے پہلے جن لوگوں نے اپنی لڑکیوں پر ظلم کیے تھے اور ان کو زندہ درگور کیا تھا، جب ان واقعات کو اسلام کے بعد ان لوگوں نے سنایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قساوتِ قلبی کے ان واقعات کو سن کر بے اختیار آبدیدہ ہو گئے، سننے کی تاب نہ لا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں اور لڑکوں میں کھلانے پلانے، پالنے پوسنے میں فرق کرنے کو بھی پسند نہیں کیا۔ افسوس! آج ہم نے اپنے معاشرے کو اتنا بگاڑ لیا ہے اور ایسے حالات پیدا کر لیے ہیں کہ آج پھر لڑکی بوجھ سمجھی جانے لگی ہے، اور اب حالتِ حمل ہی میں لڑکیاں ختم کی جا رہی ہیں۔ مشینوں سے جب حمل کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکی کا حمل ہے، تو اسقاط کرا دیا جاتا ہے۔ اور یہ وبا اس درجہ عام ہو گئی ہے کہ بعض ملکوں میں عورتوں کی شرح مردوں سے کم ہو گئی ہے، جو خود مردوں کے لیے ایک مسئلہ ہے۔

حدیث نمبر (۲۰) پڑوسی کے حقوق

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَايَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ (مشکوٰۃ، ص/۳۲۲)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں نہ جا سکے گا، جس کے ظلم اور تکلیف دہی سے، اُس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔

تشریح: انسان ''مدنی الطبع'' ہے، وہ سماج میں رہتا سہتا ہے، اس کے گھر کے آس پاس دوسرے لوگ آباد ہوتے ہیں، جو اس کے پڑوسی کہلاتے ہیں۔ پڑوسی کیوں کہ قریب رہتا ہے، اس کے ساتھ گھر قریب ہونے کی وجہ سے عموماً بعض باتوں میں ناموافقت کی وجہ سے ناچاقی ہو جاتی ہے: کبھی گھر کے بچوں کی وجہ سے بچوں کا جھگڑا، دو پڑوسیوں میں جھگڑے کا سبب بن جاتا ہے؛ کبھی گھر کے کوڑا کرکٹ یا نالیوں کے پانی کے نکاس پر، جھگڑا ہو جاتا ہے؛

کبھی مزاجوں کی عدم موافقت کی وجہ سے، ترشی پیش آتی ہے؛ کبھی مال و دولت میں ایک دوسرے سے مسابقت میں، جلن حسد تک نوبت آجاتی ہے؛ کبھی بے پردگی کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے؛ کبھی چوری کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں؛ کبھی عورتیں، جھگڑے کی وجہ بنتی ہیں۔

یہ سب باتیں انسانی معاشرے میں، رات دن آپس میں خصوصاً پڑوسی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہیں۔ پیغمبر انسانوں کی نفسیات اور ان کے اخلاقی امراض سے واقف ہوتا ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کے بڑے حقوق ذکر فرمائے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جبرئیل علیہ السلام نے پڑوسی کے حقوق اتنی شدت اور کثرت سے بیان فرمائے کہ مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ پڑوسی کو کہیں وراثت میں نہ شریک کر دیا جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کی ہر قسمی رعایت اور دلداری کی ہدایات دیں کہ چاہے سالن میں شوربے کا اضافہ کرنا پڑے تو اضافہ کرو اور پڑوسی کو ضرور کچھ بھیجو، معمولی چیز بھی اس کو دینے میں نہ شرماؤ، نہ اس کو کم سمجھو، اس پر بڑی بشارتیں سنائی ہیں، پڑوسی کو ستانے اور اس پر ظلم کرنے اور ہر وقت اس پر بلا وجہ دباؤ بنائے رکھنے اور اس کی خیر خواہی نہ کرنے پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور ایسے برتاؤ پر شدید وعیدیں ذکر کیں۔ اور پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کو صرف دنیاوی برتاؤ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کو دینی اور شرعی ہدایات، اجر و ثواب اور اخروی درجات کی بلندی کا ذریعہ بتلایا۔

حدیث (۲۱) یتیم کے ساتھ حسن سلوک

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُحْسَنُ إِلَيْهِ وَشَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُسَاءُ إِلَيْهِ. (مشکوٰۃ، ص/۴۲۳)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلم سماج میں سب سے بہتر وہ گھر ہے، جس میں کوئی یتیم پلتا ہو اور اس کے ساتھ وہ گھر والے حسنِ سلوک کرتے ہوں۔ اور مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بُرا گھر وہ ہے، جس میں کوئی یتیم رہتا ہو اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو۔

تشریح: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے، کیوں کہ خود بھی یتیمی کی زندگی گذاری تھی، اس لیے یتیموں کے باب میں بے پناہ ہدایات، اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے مال کی حفاظت اور اس کو احتیاط کے ساتھ خرچ کرنے اور جوانی کے بعد، جب کہ ان میں مال خرچ کرنے کا سلیقہ پیدا ہو جائے، ان کے مال کو، اُنھیں سپرد کرنے کی ہدایات دی ہیں۔

نیز یتیم کی پرورش، اس کی نگہداشت پر بڑے اجر و ثواب کی بشارت سنائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس گھر میں شیطان نہیں گھس پاتا، جس میں یتیم کی پرورش کی جاتی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس پیالے میں شیطان کو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی، جس میں یتیم کو ساتھ کھلایا جاتا ہو۔ اُس زمانہ میں جنگیں پیش آتی تھیں، اس لیے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی یتیم ہوتا تھا، اور عموماً لوگ یتیم کے ساتھ اپنی اولاد کے مقابلے میں دوسرے درجے کا برتاؤ کرتے اور اس کے مال کو جو اُسے وراثت میں ملا ہوتا تھا، احتیاط سے خرچ نہیں کرتے تھے، جس کی وجہ سے وہ مال یتیم کے جوان ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا تھا، اور یتیم زندگی کے میدان میں خالی ہاتھ ہو جاتا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں حالات کے پیشِ نظر، امت کو یتامیٰ کی پرورش،

ان کے ساتھ حسن سلوک پر بڑی بشارتیں ذکر فرمائیں اور اس پر سختی اور اس کے معاملہ میں لاپرواہی اور اس کی تعلیم و تادیب اور ہنر سکھانے پر دھیان نہ دینے پر سخت وعیدیں ذکر فرمائیں۔ قرآن نے فرمایا: "وأما اليتيم فلا تقهر" کہ یتیم کو نہ جھڑکو۔ اس کے ساتھ برا برتاؤ نہ کرو، تم کو اللہ نے یتامت سے محفوظ رکھا، اس کے صلہ میں ہر یتیم کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرو۔

حدیث نمبر (۲۲)

دوسروں کی عیب پوشی کا ثواب

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَأَى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا كَانَ كَمَنْ أَحْيَى مَوْؤُدَةً. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ صَحَّحَهُ. (مشکوۃ ص/۴۲۴)

ترجمہ: عقبہ بن عامر سے روایت ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کسی کا عیب دیکھے اور اس کو چھپائے، تو گویا اس نے زندہ در گور لڑکی کو زندہ کر دیا۔

تشریح: بعض اچھی عادات، اچھے اخلاق، ثواب کے اعتبار سے اتنے اعلیٰ و مقبول ہوتے ہیں کہ جن کا مقابلہ بڑے بڑے اعمال نہیں کر پاتے۔ اسی طرح بعض افعال معمولی نظر آتے ہیں، مگر ان کے ذریعے اللہ کے ایک بندہ کی عزت و آبرو کی حفاظت ہو جاتی ہے، وہ بدنامی سے بچ جاتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ اتنے خوش ہو جاتے ہیں، کہ اس کو اتنا بڑا عمل گردانتے ہیں، گویا کہ اس نے زندہ در گور لڑکی کو حیات دے دی ہو۔ جیسے اس مظلوم لڑکی کے ساتھ کوئی بے رحم کا معاملہ کرے کہ اس کو اس ظلم سے بچالے، یہ عمل جیسے ہمدردی اور نیکی کے اعتبار سے عظیم ہے، اسی طرح کسی کی عیب پوشی اور اس کو بدنامی سے بچانے کا ثواب ہے۔ اگر کسی وجہ سے اپنے کسی بھائی کے عیب اور گناہ سے اس کو باخبر کرنا اور آئندہ اس سے بچنے کی ہدایت کرنا بطور خیر خواہی کے ناگزیر ہی ہو، تو اس کو تنہائی میں بلا کر مطلع کیا جا سکتا ہے، تا کہ اس کو سماج کے سامنے رسوا نہ ہونا پڑے۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایتوں اور ایسے افعال پر بشارتوں سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی مخلوق کے ساتھ کتنی ہمدردی اور محبت تھی کہ ان کو ہر قسم کی رسوائی اور بے عزتی سے بچانے کے لیے اُمت کو کیسی پیاری پیاری ہدایات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمائی ہیں۔

حدیث (۲۳) سخت دلی کا علاج

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا شَكَا اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ قَالَ: اِمْسَحْ رَأْسَ الْیَتِیْمِ وَ اَطْعِمِ الْمِسْكِیْنَ. رَوَاهُ اَحْمَدُ (مشکوٰۃ ص/۴۲۵)

ترجمہ: ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دل کی سختی اور درشتی کا شکوہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا علاج یہ ہے کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور غریب کو کھانا کھلایا کرو، دل کی قساوت ختم ہو جائے گی۔

تشریح: بعض لوگ طبعاً درشت خو، دل کے سخت، بے رحم اور خشک مزاج ہوتے ہیں؛ کسی کی پریشانی، دُکھ درد کو دیکھ کر، ان کا دل پسیجتا نہیں ہے: یہ ایک برائی ہے، روحانی مرض ہے، خوئے بد ہے۔ انسان کو جیسے جسمانی خامیاں، نقائص اور امراض لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح باطنی، معنوی، اخلاقی اور روحانی نقائص و امراض بھی لاحق ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم، کیوں کہ حکیم ہیں، انسانیت کے امراض کے نبض شناس ہیں۔ نیز انسانیت کے ہمدرد اور ان کے روحانی و اخلاقی امراض کے طبیب ہیں، اس لیے وہ اس کا علاج بھی تجویز فرماتے ہیں؛ چناں چہ قساوتِ قلبی کا علاج، آپ نے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا بتلایا، اس لیے کہ یتیم کو دیکھتے ہی انسان کو اس کی بے چارگی، سہارے سے محرومی کا تصور ہوگا، تو دل میں رقت کے جذبات بیدار ہو جائیں گے، اور دل کی رقت ہی قساوتِ قلبی کے ازالہ کا سبب ہے۔ پھر انسان ہر دُکھی اور کمزور پر رحم کھانے لگے گا اور اس کا دل پسیجنے لگے گا۔

دوسرا علاج یہ بتلایا کہ غریب کو کھانا کھلایا کرو، تاکہ غریب اور بھوکے کو دیکھ کر دل نرم ہوگا، اور لوگوں کی تنگی سامنے آئے گی اور اپنے کو آسودہ وغیر محتاج پاکر دوسروں کو کھلانے کی صلاحیت کی نعمت پر شکر کے جذبات اور خدائی فضل کا استحضار ہوگا، تو دل میں نرمی، رقت، ہمدردی اور محبت پیدا ہوگی، جس کی وجہ سے دل کی سختی اور قساوت ختم ہو جائے گی۔ انسان نے اپنی فطرت مسخ نہ کر لی ہو تو وہ دوسروں کی مدد کرکے، دوسروں کو راحت پہنچا کر، ان کو کھانا کھلا کر، ایسی فرحت، خوشی اور سکون محسوس کرتا ہے کہ جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ماحول، مادہ پرستی، حرص و ہوس نے انسان کو، سخت دل اور دوسرے کو نقصان پہنچا کر اپنے گھر بھرنے اور اپنے لیے راحتیں جمع کرنے کا خوگر بنا دیا ہے، اور سارے انسان آپس میں بھائی بھائی اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، اس کا استحضار ختم کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے غم اور درد کو دیکھ کر کوئی ہمدردی اور رقت پیدا نہیں ہوتی۔

حدیث (۲۴)

مسلمان بھائی کی عیادت کرنے کا ثواب

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: اِذَا عَادَ الْمُسْلِمُ اَخَاهُ اَوْ زَارَهٗ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی طِبْتَ وَ طَابَ مَمْشَاکَ وَ تَبَوَّاْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا۔

(مشکوٰۃ: ص/۴۲۶)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کی عیادت کرتا ہے، یا اس سے ملنے جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تو اور تیرا اپنے بھائی کے پاس آنا، مبارک اور باعث خوش خبری ہے، تو نے اپنے اس عمل سے جنت میں جگہ بنالی۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کی دل داری، خبر گیری اور راحت رسانی، بے حد پسند ہے، ساری مخلوق اس کا کنبہ ہے، اپنے بندوں کی خوشی سے اللہ خوش ہوتا ہے، سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں، ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، انسان مدنی الطبع ہے، اس کو آپس میں ملنا جلنا

ساتھ رہنا، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، غمی، خوشی میں شریک حال رہنا پسند ہے، اس سے اس کا دل خوش ہوتا ہے؛ اس لیے زندگی کے ان آداب اور حسنِ معاشرت اور دل داریوں اور مصائب میں ایک دوسرے کے کام آنے، مزاج پرسی کرنے، اپنے بھائی کی خوشی کی خاطر اس سے ملنے پر بڑی بشارتیں ذکر کی گئی ہیں، ایسے لوگوں کے لیے جنت کا وعدہ ہے، ان کی ان اداؤں کو باعث خوش خبری اور مبارک گردانا گیا ہے، پھر یہ حسنِ معاملگی اور آداب معاشرت صرف مسلم تک ہی محدود نہیں، بل کہ ہر انسان، خواہ کوئی مذہب رکھتا ہو، بہ حیثیت انسان، سب کے ساتھ ان آداب واخلاق کو برتا جانا ضروری قرار دیا گیا ہے، بل کہ دشمن اور درپئے آزار لوگوں کے ساتھ بھی ان آداب واخلاق کو اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، یہی ادائیں اور اخلاق، دشمن کو دوست بناتے اور دل جیتتے ہیں ۔

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دوحرف است

بادوستاں تلطف ، بادشمناں مدارا

بہ حیثیت انسان، انسان کے جو حقوق ہیں، ان کی ادائیگی لازمی ہے، مذہب اس میں مانع نہیں، بل کہ اس کی ترغیب دیتا ہے، اور ایک داعی، مبلغ اور مصلح کے لیے تو یہ آداب و اخلاق، اس کے مشن کے لیے کامیابی کی ضمانت اور اصلاح کے راستے کی ساری رکاوٹوں کو دور کرنے کا ذریعہ اور دور لوگوں کو قریب کرنے کا وسیلہ ہیں۔

حدیث (۴۵) مسلمان کے ساتھ قطع تعلق پر وعید

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَ یُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ. مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ (مشکوٰۃ، ص: ۴۲۷)

ترجمہ: ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے، کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زائد، سلام وکلام بند

کرے۔ اور اس طرح سے ایک دوسرے سے برتاؤ کریں کہ جب دونوں کا آمنا سامنا ہو، تو یہ ایک طرف رُخ کر کے چلتا بنے، دوسرا دوسری طرف رُخ کر کے چلا جائے، آپس میں نہ تو ملاقات کریں اور نہ سلام وکلام کریں؛ خیریت دریافت کرنا تو دور کی بات ہے۔ اور ان دونوں میں اچھا وہ شمار ہوگا، جو اس بند بول چال کو شروع کرتے ہوئے خود اس سے سلام کی ابتدا کرے۔

تشریح: معاشرے میں کبھی ایسے حالات آپس میں پیش آجاتے ہیں کہ آپس کی ناچاقی یا ایک دوسرے کی زیادتی کی وجہ سے غصے کا ماحول قائم ہو جاتا ہے، اور غصے کی وجہ سے ترکِ کلام کی نوبت آجاتی ہے؛ ظاہر ہے کہ اس قسم کی حالت کا زیادہ مدت باقی رہنا بے حد مضر ہے۔ مگر انسانی غصے کی نفسیات کے تحت یہ بھی دشوار ہے، کہ دو شخص جو آپس میں ایک دوسرے سے خفا ہو گئے ہوں، غصہ شدت پر ہو، ان کو اسی حال میں یہ کہا جائے کہ چلو فوراً آپس میں ملو، بات چیت کرو؛ ظاہر ہے کہ ان کا ماننا تو دور کی بات ہے، طیش میں آکر اور خفا ہو جائیں گے، بل کہ ناصح ہی سے لڑائی شروع کر دیں گے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انسانوں کی نفسیات سے واقف اور نباض ہیں، فرمایا: تین دن تک غصہ کا دباؤ رہتا ہے، اس لیے تین دن تک اس کو مجبور نہیں کیا، لیکن تین دن کے بعد کیوں کہ اتنے وقفے میں عموماً غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، فرمایا: اب اپنے بھائی سے قطع تعلق نہ رکھو، بل کہ اب معافی تلافی کرلو اور پہلے ہی کی طرح میل جول شروع کر دو؛ اور اس میں سب سے بہتر وہ بھائی ہوگا، جو پہل کرے، مثلاً خود سے پہلے اس کو سلام کرے، کیوں کہ سلام کو بھی متوجہ کرنے اور محبت پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے، اس لیے کہ سلام ایک دعا ہے؛ ظاہر ہے کہ دعا کے کلمات آدمی میں محبت اور خلوص کو بیدار کر دیتے ہیں اور شکر رنجی کو دور کر دیتے ہیں۔

حدیث (۲۶) بدگمانی سے بچنے کا حکم

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۲۷)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ تم لوگ بدگمانی سے بچو، اس لیے کہ اکثر بدگمانیاں، غلط اور جھوٹی ہوتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ کسی کی ٹوہ میں نہ رہو، کسی کی جاسوسی نہ کرو، کسی کے بھاؤ پر بھاؤ نہ لگاؤ، آپس میں دوسرے کو دیکھ کر نفرت سے پشت نہ پھیرو، اللہ کے بندے بنو اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

تشریح: لوگوں کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ بلا تحقیق کسی کے بارے میں خود سے یا کسی کے کہنے سے بدگمانی قائم کر لیتے ہیں، پھر اس کو اپنا دشمن، بدخواہ و بداندیش سمجھ لیتے ہیں، اور اسی کے مطابق اس سے برتاؤ شروع کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں دونوں میں دوری پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ دوسروں کی کمزوریوں کے ٹوہ میں لگے رہتے ہیں، ان کی جاسوسی کرتے یا جاسوسی کراتے ہیں، عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔

اسی طرح دوسروں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے بعض دفعہ خریداری کے مواقع پر، چیزوں کو زیادہ قیمت پر لینے کا اظہار کرتے ہیں اور زیادہ قیمت دینے کی بولی لگاتے ہیں، حالاں کہ نیت خریدنے کی نہیں ہوتی، مقصد یہ ہوتا ہے کہ خریدار قیمت بڑھاوے اور اس کو مہنگا لینا پڑے۔ بعض مرتبہ خود بائع، لوگوں کو ایسا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، تا کہ ان کو اپنی چیز کی قیمت زیادہ مل جائے۔

اس طرح آپس میں حسد، بغض کی بھی لوگوں میں عادت ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کا برا چاہتے ہیں، دشمنی رکھتے ہیں، اور ایک دوسرے کی ترقی پر جلتے اور اس کا زوال چاہتے ہیں۔ بعض لوگ دشمنی کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اتنی دوری بڑھا لیتے ہیں کہ آمنا سامنا بھی گوارہ نہیں کرتے، دیکھتے ہی پشت پھیر کر کنی کاٹ جاتے ہیں، علیک سلیک کی نوبت ہی نہیں آپاتی۔ ظاہر ہے انسانی معاشرہ میں یہ سب باتیں، انتہائی بری ہیں، اسلام جو حسنِ معاشرت اور آپس میں بھائی چارے، محبت اور یگانگت کی تعلیم دیتا ہے، وہ ان عادات واخلاق کو کہاں برداشت کر سکتا تھا، اس لیے اسلام کے پیغمبر نے شدت سے ان برائیوں سے روکا اور ان پر وعیدیں سنائی ہیں۔

حدیث (۴۷)

مؤمن کو تکلیف پہنچانے پر لسان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لعنت

عَنْ أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا أَوْ مَكَرَ بِهٖ۔ (مشکوٰۃ، ص/۴۲۸)

ترجمہ: ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وہ شخص ملعون ہے، جو کسی مومن کو ستائے اور مکر وفریب سے اس کو مصیبت میں مبتلا کرے۔

تشریح: وہ شخص اللہ کی رحمت سے دور رکھا جائے گا، یا دور رہے گا، اس پر اللہ کی نوازشات نہیں کی جائیں گی، جو کسی مسلم کو ستائے یا تکلیف دے۔ کسی بھی مخلوق کو ستانا گناہ ہے، چہ جائے کہ کوئی اشرف المخلوقات انسان کو اور انسانوں میں بھی اہلِ ایمان کو نقصان پہنچائے۔

مسلم کی قید تغلیبی ہے، اس لیے کہ زیادہ تر ایک مسلمان کے معاملات، مسلمان ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں، زیادہ تر رہائش، برتاؤ، شادی، غمی میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ہی یہ روابط اور رشتہ رکھتا اور ہر نماز میں جمع ہوتا ہے مسلم کی قید ذکر کی گئی ہے بل کہ اگر یہ کہا جائے کہ تکوینی طور پر قدرت بعض کو خوش حال اور بعض کو تنگ حال اس لیے

رکھتی ہے، تا کہ خوشحال لوگوں کا تنگ حال کے ذریعے امتحان لے کہ وہ ان پریشان اور نادر لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ کتنا ایثار اور قربانی ان لوگوں کے لیے کر کے اپنی فراخی اور کشادہ دستی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگر دنیا میں کوئی تنگ دست، بیمار اور پریشان حال مظلوم اور مصیبت رسیدہ ہی نہ ہوتا، تو خوشحال اور مال دار اور طاقت ور لوگوں کا امتحان کس طرح ہوتا، ان کے امتحان کے لیے کچھ لوگوں کا کمزور رکھنا ضروری تھا۔ اسی طرح صبر کے امتحان کے لیے، کچھ لوگوں کا کمزور، مظلوم، تنگ دست رکھنا ضروری تھا، تا کہ نعمتوں کے سلب اور ضبط کر لینے پر یہ لوگ صبر کر کے اپنے امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔

درحقیقت یہ دنیا دارالامتحان ہے، اس میں کسی کا کسی چیز میں امتحان ہو رہا ہے، کسی کا کسی دوسری بات میں، تا کہ تمام کو ان کے امتحانات میں پرکھا جائے، کوئی صبر کا پرچہ دیا گیا ہے، کوئی شکر کا، دیکھنا ہے کون اپنے پرچے کو کتنا اچھا لکھتا ہے۔

حدیث (۲۸) برائی کے بعد فوراً اچھائی کرنا

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ: اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُ مَا کُنْتَ وَ اَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ. رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَ الدَّارِمِیُّ. (مشکوۃ: ص/۴۳۲)

ترجمہ: ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جہاں کہیں بھی ہو ہر جگہ اللہ کی نافرمانی اور اس کے محاسبہ سے ڈرتے رہو اور اگر کوئی گناہ یا برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد فوراً کوئی نیکی یا ثواب کا کام کر لیا کرو، جو اس گناہ اور برائی کو مٹا دے گا اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ، آپ کے اس ارشاد کو احمد، ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: انسان کو برائیوں سے روکنے، خلاف شرع امور سے بچانے اور خدا رسول کے

احکام کی خلاف ورزی اور نافرمانی سے بچانے والی چیز تقوی ہے، یعنی خوف خدا، مواخذۂ خداوندی کا احساس، "ان بطش ربک لشدید" کا استحضار، اللہ کے قہار و جبار ہونے کا تصور ہی انسان کو اندھیرے ، اجالے، تنہائی و جلوت اور خلوت میں اللہ کی نافرمانی سے باز رکھتا ہے۔

پھر بھی انسان بوجہ بشریت، بوجہِ عجز و کمزوری، بوجہِ نفس و شیطان کے ورغلانے، بوجہِ سماج اور اولاد کے خوف یا دل داری اور بطور رواداری یا دباؤ اور لحاظ کے کچھ نہ کچھ تعدی اور نافرمانی کر بیٹھتا ہے، تو اس کے ازالہ کی ترکیب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے: کہ ہر نافرمانی کے بعد فرماں برداری، ہر گناہ کے بعد نیکی، ہر برائی کے بعد کوئی اچھا کام فوراً کرلیا کرو، انشاء اللہ وہ اچھائی اور نیکی اس برائی اور گناہ کو مٹادے گی: "ان الحسنات یذھبن السیئات" اچھائیاں برائیوں کو مٹادیتی ہے، یعنی ختم کردیتی ہے، جیسے صابن میل کچیل کو دھودیتا ہے۔

آپ نے فرمایا: کہ لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آؤ، اگر کسی سے خطا ہو جائے، تو معاف کردو، برائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ دو، اگر تم سے کوئی زیادتی ہوجائے، تو اس کا حق دے دو، یا اس سے معافی چاہ لو، ہر ایک کے دُکھ، درد میں کام آؤ، محبت اور حسنِ ظن سے کام لو، انصاف کا برتاؤ کرو، بڑوں کا ادب ولحاظ اور چھوٹوں سے شفقت اور پیار کا برتاؤ کرو۔

حدیث (۲۹) مومن بھولا بھالا اور کافر شاطر اور چالباز ہوتا ہے

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ وَالْفَاجِرُ خِبٌّ لَئِيْمٌ. (مشکوۃ ص/۴۳۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مومن، بھولا اور شریف ہوتا ہے، اور فاسق وفاجر آدمی، شاطر اور کمینہ ہوتا ہے۔

تشریح: مومن میں چال، فریب اور عیاری نہیں ہوتی، وہ تو سیدھا، اچھا، سچ سے بری اور بھولا ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص سے حسن ظن رکھتا ہے، کسی کے بارے میں بدگمانی نہیں کرتا، وہ ہر مسلمان کو سچا، ایمان دار سمجھ کر اس کی بات پر اعتماد کر لیتا ہے، اس کو کوئی دھوکا دے، تو اس کو گوارہ کر لیتا ہے، مگر وہ خود کبھی کسی کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کرتا، برخلاف منافق اور فاسق وفاجر اور گنہگار کے، کہ وہ شاطر اور کمینہ ہوتا ہے، اس کی ہر بات اور ہر فعل پر فریب اور نقصان پہنچانے والا اور تیز حاشی ہوتا ہے، اس سے خیر اور نفع کی توقع دشوار ہے۔ لہذا جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر مومنانہ شان پیدا کریں، کسی کے درپے آزار نہ ہوں۔

شرافت، سخاوت ان کی ہر ادا سے ظاہر ہونا چاہیے، یہی خصلت اس کو اللہ رسول کی نگاہ میں مطلوب محبوب اور مقبول انسان بنائیں گی۔ برخلاف کمینے انسان کے، کہ چند دن میں ہی اس کی اوقات معلوم ہو جاتی ہے، اور وہ ناپسندیدہ انسان بن جاتا ہے، لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، اس کی ان چالوں سے واقف ہو جاتے ہیں، جن کو وہ اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے، اور اپنے ان ناپاک عزائم کے لیے دھوکا دہی کو اپنا وطیرہ بنا لیتا ہے۔

حدیث (۳۰) مرکز حسن اخلاق

وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ،

(مشکوۃ:ص/۴۳۲)

ترجمہ: مالک بن بلغہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ میں حسنِ اخلاق کی تکمیل وتمیم کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

تشریح: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے خاتم الانبیا ہیں، اسی طرح آپ حسنِ اخلاق کے بھی خاتم ہیں، کہ آپ پر اعلیٰ اخلاق کا اتمام اور انتہا ہو چکی، اب دنیا میں اس سے اعلیٰ اخلاق کا معلم یا اعلیٰ اخلاق کا حامل مبعوث نہیں ہوگا، آپ پر اس کی انتہا ہو چکی، آپ اس کے خاتم ہیں، اب جس کو بھی کوئی اخلاقی ہدایت یا تعلیم یا اسوۂ حسنہ حاصل کرنا ہے، تو اس کو آپ ہی کی سیرت اور پاکیزہ زندگی میں ملے گا، آپ ہی آئیڈیل ہیں، آپ ہی نمونہ ہیں، آپ کی تعلیم، آپ کی سیرت، آپ کے اخلاق آخری ہیں، ان سے اعلیٰ اور افضل کا اب قیامت تک تصور نہیں کیا جا سکتا، اب قیامت تک پورے عالم کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اخلاق ہی اسوہ اور معیار ہیں، ایثار، ہمدردی، محبت، عفو و درگزر، داد و دہش، جود و کرم کوئی ایسا خلق نہ تھا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یکتانہ ہوں، جو خوبیاں دوسروں میں انفرادی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں، اللہ تعالیٰ نے ساری خوبیوں کو اکٹھا کر دیا تھا۔

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیس علی اللّٰہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

حدیث (۳۱) ظاہر و باطن کو عمدہ کرنے کی دعا

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَأَحْسِنْ خُلُقِيْ. (مشکوٰۃ، ص/۴۳۲)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: کہ اے اللہ! آپ نے میری صورت اچھی بنائی ہے، پس آپ میری سیرت بھی اچھی بنا دیجئے۔

تشریح: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو صورت اور سیرت دونوں کے اعتبار سے اعلیٰ اور افضل تھے۔ قرآن کی خبر کے مطابق، خلق عظیم کے حامل تھے۔ اس کے باوجود کیوں کہ بندے کو اپنی عبدیت کے اظہار میں لگا رہنا چاہیے، یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے: لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود حسن خلق کی دولت سے مالا مال ہونے کے، مزید حسن خلق کی دعا فرماتے رہتے تھے: جیسے باوجود "اُوتیت علم الأولین و الآخرین" کے "رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا" کی دعا کے لیے حکم دیا گیا، چناں چہ یہ دعا فرماتے رہتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ، علم، اللہ کی صفت ہے، اور اللہ کی صفت لامحدود ہوتی ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، ہر درجے سے اوپر درجات موجود ہیں۔ نیز " تخلقوا باخلاق اللّٰه" کہا گیا، یعنی اللہ کے اخلاق اختیار کرو۔ اللہ کے اخلاق، کرم، عفو، حلم اور رحم وغیرہ صفات کا وافر حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا، پھر بھی آپ خلق حسن کی دعا فرمایا کرتے تھے، اس میں امت کے لیے تعلیم بھی مقصود تھی کہ اچھے اخلاق پیدا کریں اور اس کے لیے جس ضبطِ نفس اور صبر جمیل کی ضرورت پڑتی ہے، اس کی کوشش جاری رکھیں۔ آدمی کا شریف خاندان میں پیدا ہونا، مال دار ہونا، کسی منصب پر فائز ہونا، اس کے جسم اور اعضا کا موزوں اور خوبصورت ہونا، اس کی شخصیت کے نکھار کے لیے کافی نہیں، اس کی شخصیت کی بلندی اور عند الناس اور عند اللہ مقبولیت کے لیے اس کے اخلاق اور اس کی عادات کا اچھا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اللہ سے اپنے لیے حسن خلق کی دعا بھی کرتے رہنا چاہیے اور اپنا محاسبہ بھی کرتے رہنا چاہیے، کوتاہیوں پر معافی مانگنی چاہیے۔

حدیث (۳۲) غصہ کو پی جانا بہادری ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ. (مشکوٰۃ ص ۴۳۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پہلوان وہ نہیں ہے، جو کسی کو کشتی میں پٹخ دے، بل کہ پہلوان وہ ہے، جو غصے کے وقت اپنے اوپر کنٹرول رکھے، اور اپنے آپ کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔

تشریح: انسان اپنی جسمانی قوت تو کھاپی کر ورزش کر کے بڑھالیتا ہے، حتیٰ کہ وہ اتنا قوی اور پہلوان ہو جاتا ہے کہ اچھے اچھے سورماؤں اور پہلوانوں کو شکست دے دیتا ہے۔ مگر نفس پر کنٹرول مشکل ہوتا ہے، نفس کو قابو میں رکھنا دشوار ہوتا ہے، جہاں کوئی خلاف طبع معاملہ پیش آیا، یا کسی نے کوئی سخت بات کہہ دی، یا کوئی کمزور سے قصور ہو گیا، یا زیر دست یا ماتحت یا گھر کے افراد سے کوئی چوک ہو گئی، یا کسی ملازم سے غلطی اور بھول ہو گئی، تو آدمی اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے، بلا بدلہ لیے یا بلا سزا دیئے اس کو صبر نہیں آتا، بل کہ سزا دینے اور بدلہ لینے میں بھی زیادتی اور تشدد تک سے گریز نہیں ہوتا؛ اچھے اچھے پڑھے لکھے اور سنجیدہ کہلانے والے لوگ بھی غصے کے وقت بے قابو ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ پھر اگر آدمی ذی اقتدار یا کسی منصب پر فائز ہو، تب تو غصے کے وقت اس کی کیفیت ہی عجیب ہو جاتی ہے، وہ اپنے نفس کے ہاتھوں بے قابو ہو جاتا ہے، بل کہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں نے بدلہ نہ لیا، تب تو مجھے صاحب اقتدار کون کہے گا۔

حالاں کہ بدلہ نہ لینا اور معاف کر دینا، اور بڑی نافرمانی یا بڑا نقصان ہونے پر جب آدمی معاف کر دیتا ہے، تو سامنے والے شخص اور دوسرے تمام ہی لوگوں پر اس کی اس وسیع الظرفی اور حلم پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت اور بڑائی گھر کر جاتی ہے۔ قصوروار شخص زندگی بھر کے لیے اس کا ممنون احسان ہو جاتا ہے۔ اگر چہ نافرمانی

اور نقصان کے موقع پر ضبط نفس مشکل ہوتا ہے، لیکن اگر انسان یہ سوچ لے، کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام ہوں، مجھ سے اس کی رات دن میں کتنی بڑی بڑی نافرمانی ہو رہی ہے، اور وہ مجھ کو سزا دینے اور بدلہ لینے میں، میرے مقابلے میں لاکھ گنا قادر اور قوی ہے، تب بھی وہ مجھے ہر گھڑی معاف کر رہا ہے، تو مجھے بھی اپنے قصوروار کو معاف کر دینا چاہیے، کہیں اللہ تعالیٰ مجھے سزا دینے لگے اور معاف نہ کرے تو حشر کے میدان میں میرا کیا حال ہوگا۔

ہمارے بڑوں کی بہت سی مثالیں بڑے بڑے قصورواروں کو معاف کرنے کی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، جن کو ہم بڑے فخر سے سناتے اور عزت پاتے ہیں، تو ہم کو اپنی عملی زندگی میں بھی مثال پیش کرنی چاہیے۔

حدیث (۳۳) تکبر کا انجام جہنم

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَ الْعَظَمَةُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ وَاحِدًا مِنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ

(مشکوۃ، ص ۴۳۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بڑائی میری چادر ہے، بلندی میرا ازار جامہ ہے، جو ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی مجھ سے کھینچے گا اس کو میں جہنم میں داخل کر دوں گا۔

تشریح: بلندی، بڑائی، کبر و غرور اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات ہیں جو اس کے لیے مخصوص ہیں، اور اسی کو زیب دیتی ہیں۔ اب اگر کوئی بندہ ان صفات کی طرف اپنے آپ کو منسوب کر کے فخر، کبر، غرور اور عظمت کا مدعی ہوتا ہے، ان کو اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک حسی اور مجازی مثال سے سخت گستاخانہ فعل قرار دیا ہے، اور اپنی ناراضگی ظاہر کی ہے، بل کہ دوزخ کی وعید سنائی ہے۔

اگر کوئی چھوٹا اپنے بڑے کی چادر یا پاجامہ پکڑ کر کھینچے یا اتارے، تو اس کو بہت بڑی

گستاخی اور بڑے کی سخت ناراضگی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ پھر اگر یہ گستاخی اللہ کی جناب میں کی جائے تو اس کی شناعت میں اور سخت شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اتنی سخت مثال دے کر بندوں کو کبر و غرور، فخر و بڑائی اور اپنے کو بلند سمجھنے، جس کے نتیجے میں دوسروں کی حقارت، تنقیص، بے عزتی اور ان کو اپنے سامنے گرا ہوا سمجھنا لازم آتا ہے۔ جو اخلاقی طور پر بہت بڑی بُرائی سمجھی گئی ہے۔ اصل میں کبر و غرور اُن صفات پر ہونا چاہیے جو صفات کسی کے پاس اپنی ذاتی ہوں کسی کی عطائی بخششی نہ ہوں: اللہ کی تمام صفات اس کی اپنی ذاتی ہیں کسی کی عطائی نہیں ہیں، جب ذاتی ہیں تو اس کو اپنی ان صفت کے اظہار اور بیان کرنے کا پورا حق حاصل ہے، برخلاف بندے کے، کہ اس کی کوئی صفات اس کی ذاتی اور خانہ زاد نہیں ہے، اس کی ہر صفت خواہ علم و فضل ہو، یا ہنر و کمال ہو، یا حسن و جمال ہو، یا مال و دولت ہو، منصب و مقام ہو، شہرت و عزت ہو، یا خود اس کا وجود اور صحت و عافیت، یا جود و سخا ہو، خوش خلقی ہو، یا ہمدردی، نیک نامی ہو۔ غرض ہر صفت چھوٹی سے چھوٹی خوبی ہو یا بڑے سے بڑی، یہ خوبیاں اس کے اندر اپنی نہیں ہیں، اللہ کی عطا، اس کی بخشش، اُس کا فیض، اس کی صفات کا عکس، حتی کہ خود بندے کا وجود بھی اور اس کی بقا بھی اسی کی عطا ہے۔ جب یہ بات ہے، تو دوسرے کی دی ہوئی چیز پر فخر و غرور، کبر و اتراہٹ کیوں؟۔

حدیث (۳۴) قدرت کے باوجود لوگوں سے درگذر کرنا

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: قَالَ مُوْسیٰ بْنُ عِمْرَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا رَبِّ مَنْ أَعَزُّ عِبَادِکَ؟ قَالَ مَنْ إِذَا قَدَرَ غَفَرَ

(مشکوٰۃ، ص/۴۳۳)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ اے میرے رب! تیرے بندوں میں سب سے قوی کون بندہ کہلاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ بندہ جو اپنے دشمن پر غلبہ

پا جانے، اور اس پر قادر ہونے کے بعد اس کو معاف کر دے۔

تشریح: جب کہ اس کو بدلہ لینے کا پورہ موقع اور قدرت حاصل ہوگئی ہو، پھر بھی معاف کر دے۔ یہ حوصلے، ہمت اور بڑے وسیع دل کی بات ہے، ورنہ تو دنیا میں قدرت پا جانے کے بعد اپنے مقابل کو اتنا ذلیل، رسوا اور ستایا جاتا ہے کہ جس کی کوئی انتہا ہی نہیں، ہمارے بدلے لے لیے جاتے ہیں۔ اس کی کوئی معذرت، کوئی عاجزی، کوئی معافی، چاہے کتنی ہی ندامت اور دل کی گہرائی سے ہو، غصے اور انتقام کے غیض میں کچھ نہیں سنا جاتا۔ بعضے تو اپنے دشمن کا مثلہ تک کر ڈالتے ہیں، اس کے دل، گردے، جگر چبا جاتے ہیں، اس کو غصے میں جلا ڈالتے ہیں، تب بھی ان کے انتقام کی آگ نہیں بجھتی۔ حالاں کہ بلند حوصلگی اور بڑائی کی بات یہ تھی کہ قدرت پا جانے کے بعد معاف کر دیا جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ والوں نے ستانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد، پوری قدرت کے بعد، جب کہ وہ سب مشکیں بندھے کھڑے تھے، ان کو معاف فرما دیا۔

اس طرح معاف کرنے سے دشمن اور ظالم پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے، وہ سامنے والے کے اخلاق اور بڑائی کا قائل ہو جاتا ہے، اور ساری زندگی اس کو اپنا محسن اور ایک شریف وسیع الظرف انسان مانتا ہے، اور پھر کبھی دشمنی کی ہمت نہیں کرتا، بل کہ اپنے ساتھ اس حسن سلوک کو دیکھ کر اگر اس پر کسی نے کبھی ظلم و تشدد کیا ہو، اور وہ اس پر قدرت حاصل کرے، تو وہ بھی اس کو معاف کر دے گا؛ وہ اپنے مقابل کے برتاؤ سے سبق لے چکا ہوتا ہے۔

یہ کام ہے تو ہمت اور اولوالعزمی کا، مگر انسان کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے، لیکن جب ہمت کر لے، تو معاف کرنے پر دل آمادہ ہو جاتا ہے، اور معاف کر کے پھر دل میں ایک خاص خوشی اور سرور محسوس کرتا ہے، اور اپنے اس عمل پر ثواب کی توقع رکھتا ہے۔

حدیث

(۳۵) مظلوم کی آہ سے بچنا

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اِيَّاكَ وَ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّمَا يَسْئَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى حَقَّهُ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْنَعُ ذَا حَقٍّ حَقَّهُ. (مشکوٰۃ: ص/۴۳۵)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم مظلوم کی بددعا سے بچو، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی حق دار کو اپنا حق وصول کرنے سے نہیں روکتا۔

تشریح: انسانی معاشرہ میں لوگ حرص، لالچ، مال کی محبت میں اس درجہ پر اتر آتے ہیں کہ مال کی تحصیل میں حرام وحلال کی تمیز بھی بھلا بیٹھتے ہیں۔ کسی کے بھی مال و جائداد اور روپے پیسے واسباب پر ناجائز قبضہ کر لیتے ہیں، یا ان پر کسی کا حق ہوتا ہے، تو اس کو وقت پر نہیں دیتے، ٹال مٹول کرتے ہیں، یا دبا لیتے ہیں، دیتے ہی نہیں ہیں؛ یا کسی کو کمزور پا کر اس کو مارتے پیٹتے ہیں، یا رسوا کرتے ہیں، یا اس پر کوئی تہمت لگا دیتے ہیں، جس سے اس کی کردار کشی ہوتی ہے، یا اس کے خلاف حکومت یا کسی قوی سے چغلی کھا کر اس کو نقصان پہنچاتے ہیں، یا اس کی روزی روٹی پر حملہ کرتے ہیں، یا اس کی اولاد کو یا بیوی کو اس کے خلاف کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ مظلوم اور دبا ہوا بے یار و مددگار ہاتھ پھیلا کر اپنے اللہ سے اس کی شکایت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ایسے مظلوم کی مدد کرتے ہیں اور ظالم کو سزا دیتے ہیں اور مظلوم کو اس کا حق دلا کر رہتے ہیں۔ اگر کسی مصلحت سے وہ حق دنیا میں نہ دلایا، تو آخرت میں دلانا تو طے ہے، اس لیے کہ اگر نہ دنیا میں دلایا گیا اور نہ آخرت میں، تب تو پھر اللہ تعالیٰ منصف اور عادل کیسے کہلائیں گے، جب کہ عدل ان کی ایسی صفت ہے، جو کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہی تو آخرت اور اس کے فیصلے کی دلیل ہے، کہ بہت سے لوگ دنیا میں مظلوم مر جاتے ہیں، ان کو

یہاں انصاف نہیں مل پاتا، تو یقیناً ایک جگہ ایسی ہے، جہاں ان کو انصاف ملے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے، ایسا ہو نہیں سکتا کہ انصاف نہ کریں، اس کا حق نہ دلائیں، اور جب دنیا میں نہ ملا، تو یقیناً ایک ایسی جگہ ہے، جہاں اس کو ضرور انصاف ملے گا؛ اس کا حق ظالم کی نیکیاں لے کر یا مظلوم کی بدیاں ظالم پر ڈال کر انصاف دلایا جائے گا۔

بہر حال انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا سے ظالم بن کر نہ جائے، چاہے مظلوم بن کر چلا جائے، کہ وہاں بدلہ مل جائے گا۔ جب یہ بات ہے، تو انسان کو ظلم و تعدی اور ایذا رسانی سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں مظلوم نے زبانِ قال یا زبانِ حال سے اللہ کی جناب میں فریاد کر دی، تو پھر ظالم کی خیر نہیں، یا تو دنیا ہی میں یا پھر آخرت میں ظلم کی سزا یقینی ہے، اور اللہ کی سزا بے حد سخت ہوگی: "لا یعذب عذابه أحد"۔

حدیث (۳۶) برائیوں سے روکنے کا حکم

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ ِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ: مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَ ذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ . (مشکوۃ: ص/۴۳۶)

ترجمہ: ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں: کہ جو شخص کسی گناہ کو ہوتے ہوئے دیکھے، تو اس کو طاقت سے روکے؛ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو زبان سے روکے؛ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو، کم از کم دل سے برا جانے، اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔

تشریح: ایک مسلمان میں بہ حیثیت مسلمان اتنی ایمانی حمیت و غیرت ہونا چاہیے کہ اگر اللہ کی نافرمانی ہوتے دیکھے، شریعت کا خلاف لوگ برسرِ عام کر رہے ہوں، تو اگر اس کو اقتدار یا وجاہت یا کسی بھی اعتبار سے ایسی قدرت حاصل ہو کہ طاقت کے ذریعے اس کو روک سکے، تو

روکنا چاہیے۔ مثلاً بادشاہ، وزیر، مقامی حاکم، سرپنچ، گرام پنچایت کا ممبر ہو، یا باپ ہو، دادا ہو، استاذ ہو، شیخ ہو، یہ لوگ زبردستی اپنا غصہ، ناراضگی یا مار کی دھمکی دے کر روک سکتے ہیں، بلکہ پٹائی کاٹ کی دھمکی بھی دے سکتے ہیں۔

لیکن اگر ایسی قدرت نہ ہو، تو پھر زبانی طور پر تنہائی میں بلا کر سمجھا کر روک دیں، یا بیانات میں بلا کسی تعیین کے، اس برائی کی مذمت اور اس پر ذکر کردہ وعیدوں کو بیان کردے۔

نیز اگر مضامین لکھ کر اس گناہ کی شناعت ظاہر کریں اور وعیدیں تحریر کریں، تو یہ بھی زبان سے روکنے میں شمار ہے، کہ چاہے منہ کی زبان ہو، یا قلم کی زبان، یہ دونوں زبانیں ہی ہیں۔

نیز اگر اس کی قدرت نہ ہو کہ اس گناہ کے مرتکب اتنی وجاہت اور اقتدار والے اور مقتدرت رساں ہیں، کہ ان کے سامنے زبان سے کہنا بھی دشوار ہے، لکھنا بھی مشکل ہے، تو کم از کم دل سے تو اس گناہ کو برا سمجھے، اس کو ہوتے دیکھ کر اس کا دل کڑھے، یہ اس کے ایمان کی غیرت، خدادوستی کی علامت ہے، کہ ان کے حکم کی نافرمانی دیکھی نہ جائے، عزیمت تو یہ تھی کہ طاقت یا زبان سے روکتا، چاہیے اس کی سزا میں تکلیف ہی اٹھانی پڑتی، مگر یہ نہ کر سکے، تو رخصت کا درجہ ہے کہ دل سے تو برا جانے اور انتظار کرے، دعا کرے کہ جب ایسا وقت آجائے گا کہ زبان یا طاقت سے روک سکیں گے، تو ضرور روکیں گے۔

حدیث (۳۷) گناہ سے دلچسپی بھی گناہ

عَنِ الْعُرْبَاسِ بْنِ عُمَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: إِذَاعُمِلَتِ الْخَطِيْئَةُ فِي الْأَرْضِ مَنْ شَهِدَهَا فَكَرِهَهَا كَانَ كَمَنْ غَابَ عَنْهَا وَ مَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِيَهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا. (مشکوۃ:ص/۴۳۶)

ترجمہ: عرباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دنیا میں کسی جگہ کوئی گناہ کیا جارہا ہے، تو جو شخص وہاں موجود ہو اور گناہ کو ناپسند کرتا ہے، وہ گویا ایسا ہے کہ وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اور جو شخص وہاں موجود تو نہ ہو، مگر اس گناہ کو پسند کرتا ہو، تو گویا وہ وہاں موجود تھا۔

تشریح: کسی گناہ کو ہوتے دیکھ کر نکیر کرنا، اپنی مقدور بھر نفرت کا اظہار کرنا، آدمی کو اس گناہ سے ایسا بری کردیتا ہے گویا اس کی موجودگی میں وہ گناہ ہوا ہی نہیں، جس پر اس کی باز پرس ہو کہ روکا کیوں نہیں۔ اور جو شخص برائی کی جگہ موجود تو نہیں تھا، مگر اس برائی کو پسند کرتا ہے، خود بھی عادی ہے، یا یہ کہ اگر وہ یہاں موجود ہوتا، تو قطعاً نہ روکتا، بل کہ تائید کرتا، تو ایسا شخص باوجود اس کے کہ وہ وہاں موجود نہ تھا، مگر اس کو موجود سمجھا جائے گا، اور اس گناہ پر نکیر نہ کرنے کی وجہ سے مجرم سمجھا جائے گا۔

اسلامی حمیت وغیرت کا تقاضا ہے کہ بندہ اللہ کی نافرمانی کو برداشت نہ کرے، بل کہ جہاں نافرمانی ہو رہی ہو، یا جو لوگ نافرمانی کررہے ہوں، ان سے فوراً بے زاری اور نفرت کا اظہار کرے، اور اپنی مقدور بھر روکنے کی کوشش کرے، طاقت سے یا زبان سے یا پھر دل سے برا سمجھے، اور وہاں سے چلا جائے، اگر وہ ایسا کرتا ہے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، ایسا سمجھا جائے گا کہ گویا یہ نافرمانی اس کے سامنے ہوئی ہی نہیں۔ اور اگر وہ وہاں موجود تو نہ تھا، مگر اس برائی کو اور نافرمانی کو برا بھی نہیں سمجھتا، بل کہ اس سے خوش ہے، اور اگر وہ وہاں موجود ہوتا، تو قطعاً نہ روکتا، تو ایسا شخص اس برائی میں شریک اور موجود گنا جائے گا، اور اس پر بھی وہی گناہ ہوگا، جو مرتکبین پر ہوگا۔

حدیث (۳۸) دنیا مومن کیلئے قید خانہ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ (مشکوۃ: ص/۴۳۹)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔

تشریح: (۱) یعنی مومن کے لیے جو اعلیٰ قسم کی بے مثال نعمتیں جنت میں مہیا کی گئی ہیں، ان کے مقابلے میں مومن کو دنیا میں کتنی ہی اعلیٰ نعمتیں میسر ہو جائیں، تب بھی جنت اور اس کی راحتوں، وسعتوں، مسرتوں اور آزادیوں کے مقابلے میں، دنیا اپنی تمام تر نعمتوں اور خوش حالیوں کے باوجود، یہ قید خانہ اور محدودیت لیے ہوئے ہے: اس کی نعمتیں فانی، ناقص، کسی نہ کسی درجہ میں بامضرت اور ہر وقت خطرے میں زوال پذیر، چوری ڈاکہ کی زد میں، حسد و جلن کی آماج گاہ، بیماری اور بڑھاپے میں بے مزہ اور فانی ہوتی ہیں: جب کہ جنت کی نعمتیں، راحتیں، وسعتیں، مسرتیں دائمی، کامل، کبھی نہ ختم ہونے والی، لازوال اور نہ چھن جانے کا خطرہ، نہ کسی کے حسد و جلن کا خطرہ، بل کہ ہر وقت ان میں اضافہ اور تنوع، راحت ہی راحت

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

جنت کی ان راحتوں کے تصور کے مقابلے میں یقیناً دنیا مومن کے لیے ایک بندش، ایک قید خانہ ہے۔

اسی طرح ایک کافر کو دوزخ میں جو تکالیف، عذاب، بے عزتی، تحقیر، جھڑکی، ذلت، خون پیپ کی غذا، انتہائی گرم پانی، کانٹوں دار زقوم کی ناہضم ہونے والی غذائیں اور اس پر انتہائی درجے کی مار پیٹ، سر پر گرم کھولتا پانی اور گرزوں سے کوٹا جانا، سخت ترین آگ، انتہائی

گھیرے آگ کے کنوؤں میں ڈالا جانا، بڑے بڑے سانپ بچھوؤں کا کاٹنا وڈسنا، یہ سب جہنمی سزا میں جو ایک کافر کو آخرت میں اس کے کفر کی وجہ سے مقدر ہیں، یقیناً ان کے مقابلے میں کافر دنیا میں چاہے کتنے ہی دکھ، درد، تنگی، مصیبت میں ہو، چاہے یہاں کتنا ہی ذلیل و خوار اور پریشان ہو، تب بھی جہنم کے مقابلے میں وہ ان تمام آلام و مصائب کے باوجود دنیا میں آرام میں ہے: اگر جہنم کا تصور کرے، تو بھی دنیا سے جانا نہ چاہے گا، وہ ان دکھوں بھری دنیا ہی کی زندگی کو اپنے لیے جنت سمجھے گا۔

دنیا میں مومن کی زندگی، شرعی حدود اور پابندیوں کی وجہ سے، غیر آزادانہ پابند زندگی ہے، اس لیے ان پابندیوں کی وجہ سے دنیا اس کے حق میں جیل خانہ کہا گیا ہے، جیسے جیل خانہ میں قیدی آزاد نہیں ہوتا، جو چاہے نہیں کر سکتا، اس کو جیل خانہ کے نظم عمل کے مطابق ہی رہنا سہنا پڑتا ہے: بہ خلاف کافر کے کہ اس نے کسی شرعی پابندی کو قبول ہی نہیں کیا ہے، لہٰذا وہ جو چاہے کرتا ہے، اس کو حلال و حرام کی کوئی پرواہ نہیں رہتی، پوری طرح آزاد ہوتا ہے، وہ کسی پابندی کا قائل ہی نہیں، ہر فعل میں آزاد، جو چاہے کرے: لہٰذا دنیا کی یہ آزادانہ زندگی اس کے حق میں جنت ہی ہے۔

حدیث (۳۹) اصل غنا نفس کا غنا

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ. (مشکوٰۃ، ص ۴۴۰)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مال داری، مال و سامان کی کثرت کا نام نہیں، مال داری تو دل کی مال داری ہے۔

تشریح: یعنی مال و اسباب، اور اسباب راحت و تعیش سے حقیقی مال داری اور وسعت حاصل نہیں ہوتی، چاہے لوگ اس کو مال داری اور آسودگی سمجھتے رہیں، حقیقی آسودگی تو قلب کی

آسودگی ہے، قلب کی کشادگی اور فراخی ہے، جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو انتہائی آسودہ، مطمئن اور راحت وچین میں محسوس کرتا ہے، اس میں قناعت آجاتی ہے، وہ تھوڑے کو بھی بہت سمجھتا ہے، اس کو باوجود مال و اسباب کی کمی کے، دقت محسوس نہیں ہوتی، اس کا دل قلیل پر بھی اتنا مطمئن رہتا ہے، جتنا کہ لوگ کثیر پر مطمئن نہیں رہتے، وہ دل کی اس آسودگی کی وجہ سے اپنے پاس جو ہوتا ہے، اس میں سے پوری بشاشت کے ساتھ دوسروں پر خرچ کرتا ہے، اور دوسروں پر خرچ کر کے دلی مسرت حاصل کرتا ہے! قلبی غنا اور آسودگی کی وجہ سے وہ انتہائی خیر و برکت دیکھتا ہے، تھوڑے میں بہت کا احساس کرتا ہے۔

دل کا غنا اور آسودگی ایک ایسی کیفیت ہے، ایک ایسی صفت ہے، ایک ایسا احساس ہے، ایک ایسا اندرونی حال ہے، ایک ایسی غیر شعوری مسرت ہے، جو انسان کے پورے وجود کو، اس کی ساری زندگی کو اور زندگی کے ہر عمل میں، بشاشت اور نشاط گھول دیتی ہے؛ وہ غربت اور مال کی کمی کے موقع پر بھی اپنے آپ کو آسودہ اور خوش حال محسوس کرتا ہے، بے چینی اس کے پاس تک نہیں پھٹکتی، دل کی آسودگی اور غنا ایک دائمی اور استمراری اور پائدار وصف ہے، جب کہ ظاہری مال و اسباب کی زیادتی، وقتی اور ہنگامی سکون فراہم کرتی ہے، جہاں مال کم ہوا اور اسباب راحت میں کمی آئی، وہیں بے چینی، فکر، خوف، اور اب کیا ہوگا کے خیالات شروع ہو جاتے ہیں، اور سارا چین، بے چینی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا مال و اسباب کی کثرت، دائمی سکون کا ذریعہ نہیں ہے۔
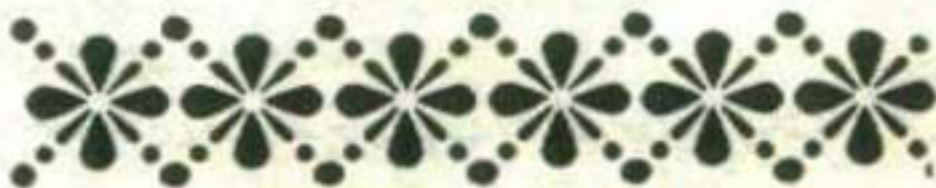
حدیث (۴۰) ہمیشہ ساتھ رہنے والے اعمال

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلَاثَةٌ. فَيَرْجِعُ اثْنَانِ وَيَبْقَىٰ مَعَهُ وَاحِدٌ. يَتْبَعُهُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَعَمَلُهُ فَيَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَيَبْقَىٰ عَمَلُهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ (مشکوٰۃ ص/۴۴۰)

ترجمہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ ہر میت کے ساتھ تین چیزیں چلتی ہیں: جس میں سے دو قبر کے پاس جا کر لوٹ جاتی ہیں، وہ مال اور اولاد ہے، اور ایک اس کے ساتھ رہ جاتی ہے، وہ اس کا عمل ہے۔ چناں چہ میت کا مال اور اس کے گھر والے اس کے ساتھ قبر تک جاتے ہیں اور میت کے دفن کے بعد واپس چلے آتے ہیں۔ عمل اس کے ساتھ قبر میں جاتا ہے، جو اس کے ساتھ رہتا ہے۔ دنیا میں انسان کے ساتھ مال، اولاد اور اس کے اچھے یا برے اعمال ہوتے ہیں: مرنے کے بعد مال اور اولاد دنیا ہی میں رہ جاتے ہیں، قبر اور آخرت میں اس کے ساتھ اس کے اچھے یا برے اعمال جاتے ہیں، وہ اس سے جدا نہیں ہوتے۔ وہ ایسے ساتھی ہیں، جو اس کا فیصلہ ہونے تک موجود رہتے ہیں۔ اگر اعمال اچھے ہیں، تو جنت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اور اگر اعمال برے ہیں، تو دوزخ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوا آخرت کی کامیابی اور جنت کے حصول کے لیے اچھے اعمال ذریعہ ہیں، اور جہنم کے دخول کا برے اعمال سبب ہیں ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے ، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں ، نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اچھے اعمال کا ذخیرہ جمع کرتا رہے، ہر عملِ خیر میں سبقت کرے، انشاء اللہ اعمالِ خیر ہی اس کو اس وقت کام آئیں گے، جس وقت اولاد، مال و دولت، عزت و جاہ

سب ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ انسانی امراض کے نباض ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مال و دولت، اہل و عیال میں غیر معمولی مشغولیت اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت و فکر میں ہر وقت سرگردانی، انسان کو عموماً فکرِ آخرت اور اعمالِ خیر سے باز رکھتی ہے، جس کی وجہ سے وہ فرائض کے ترک اور محرمات کے ارتکاب تک سے پرہیز نہیں کر پاتا، جس کے نتیجے میں وہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوتا ہے کہ مال و دولت، بیوی بچے، سب یہاں رہ جاتے ہیں، اور وہ بلا اعمالِ خیر، خالی ہاتھ آخرت میں پہونچتا ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم، اس ارشاد کے ذریعہ انسان کو احساس دلا رہے ہیں، کہ جب مال و اولاد ساتھ جانے والے نہیں، تو تم تیسری چیز کی فکر کرو اور اس سے دلچسپی بڑھاؤ جو آخرت میں ساتھ جائے اور نجات و خوشنودیٔ رب اور حصولِ جنت کا سبب بنے اور وہ اعمالِ حسنہ ہیں۔ اور اعمالِ حسنہ جہاں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہیں وہیں اسلامی اخلاق، اسلامی معیشت، اسلامی معاشرت، اسلامی معاملات اور اسلامی عقائد، اسلامی طہارات بھی ہیں۔ زندگی کے ہر باب اور ہر موڑ پر شرعی ہدایات سے رہبری و تہذیب اخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن، تینوں شعبوں میں شرعی قوانین کی پیروی ہی درحقیقت انسان کو خدا تعالیٰ کا مطلوب انسان بناتی ہے اور یہی اس کے لیے آخرت کا سرمایہ، نجات کا ضامن اور جنت کے حصول کا ذریعہ ہے۔